اعلان داخلہ بی اے ' سالِ اوّل

قرآن کالج آف آرٹس اینڈ سائنس

191۔اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور - فون:5833637 - 5860024

پنجاب یونیورسٹی کے معین کردہ نصاب کی معیاری تدریس کے ساتھ ساتھ:

- قرآن حکیم کے منتخب مقامات کا ترجمہ و تشریح
- کمپیوٹر کی لازمی تعلیم
- عربی زبان کی تدریس کا خصوصی اہتمام
- وسیع و عریض آڈیٹوریم

تدریس کا آغاز ان شاء اللہ **15** ستمبر سے ہو گا

نوٹ: ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے

مزید برآں

F.A.
F.A.(G.Sc.)
I.C.S.
I.Com.

میں لیٹ فیس کے ساتھ
داخلے جاری ہیں

اقتدار احمد ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایف اے اور بی اے کی معیاری تعلیم کا جدید ادارہ

طوبیٰ گرلز کالج لاہور (رجسٹرڈ)

بی اے ' سالِ اوّل میں داخلہ جاری ہے

- اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کے فروغ پر خصوصی توجہ
- باپردہ اور پاکیزہ ماحول
- خوبصورت اور کشادہ عمارت
- ماڈرن کمپیوٹر لیب اور کمپیوٹر کی لازمی تعلیم بلا اضافی فیس
- طالبات کے لئے ٹرانسپورٹ (Pick & Drop) کی سہولت
- بیرون لاہور کی طالبات کے لئے ہوسٹل کی محدود سہولت

مزید معلومات کے لئے پراسپکٹس حاصل کریں

طوبیٰ گرلز کالج 78 سیکٹر اے ون ٹاؤن شپ' لاہور

فون: 5114581 E-mail:toobacollege@hotmail.com

16/9/23

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۲ | رجب المرجب ۱۴۲۴ھ - ستمبر ۲۰۰۳ء | شمارہ ۹

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700 روپے ☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900 روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ اوّل

گزشتہ ماہ ہم نے بحیثیتِ قوم ۵۶واں یوم آزادی منایا۔ گو اس بار سرکاری سطح پر جشن تو نہیں منایا گیا تاہم یوم آزادی کے حوالے سے معمول کی سرکاری وغیر سرکاری تقریبات کا انعقاد بھی ہوا اور عمائدین قوم کے بلند بانگ دعاوی پر مشتمل برس ہا برس کے گھسے پٹے معمول کے بیانات بھی سننے اور پڑھنے کو ملے جن میں ان نیک عزائم کا بیانگ دہل اعلان بھی شامل تھا کہ ''ملکی سالمیت پر آنچ نہیں آنے دیں گے'' اور ''کسی کو وطن عزیز پر میلی نگاہ ڈالنے کی اجازت نہیں دی جائے گی'' وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ عالمی پریس میں پاکستان اور پاکستانی قوم کے حوالے سے جو تبصرہ آمیز بیانات ان دنوں شائع ہوئے ان میں ہماری جگ ہنسائی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ دنیا کی نگاہوں میں یہ قوم تضادات کا مجموعہ ہے' باہمی نااتفاقی اور اندرونی خلفشار کی شکار ہے' زمینی حقائق کا مواجہہ کرنے کی بجائے خوابوں کی دنیا میں رہنے کی عادی ہے' ۵۶ سال گزرنے کے بعد آج بھی سیاسی طور پر نابالغ ہے اور معاشی دیوالیہ پن ہی نہیں اخلاقی افلاس سے بھی ہمکنار ہو چکی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ کیا سطورِ بالا میں بیان کردہ حقائق پاکستانی معاشرے کی صحیح عکاسی نہیں کر رہے؟ — کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہمارے تمام قومی ادارے تباہی و بربادی کی آخری حدوں کو چھو رہے ہیں' اور ''اِک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا۔ اس کو بھی تو نے آخر چرچ کا لگا کے چھوڑا'' کے مصداق واحد بچ رہنے والا ''مقدس ادارہ'' جسے ہم فوج کے نام سے جانتے ہیں' آج اپنا تقدس و احترام کھو کر عوام کی نگاہوں میں جبر و استحصال کی علامت بن چکا ہے۔

نفاق کی علامات یعنی کرپشن' وعدہ خلافی' جھوٹ اور باہمی نااتفاقی جیسے مہلک امراض پورے جسدِ ملی پر پھوڑے پھنسیوں کی مانند اس طرح مسلط نظر آتے ہیں کہ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم! — منصوبہ بندی' پلاننگ' ملکی تعمیر و ترقی کے لئے مخلصانہ غور و فکر' قومی مفادات کے لئے ذاتی مفاد کی قربانی' یہ سب محض الفاظ ہیں جن کا خارج میں کوئی مصداق دور دور نظر نہیں آتا۔ ۵۶ برس گزرنے کے باوجود آج بھی ہم اپنی منزل کا تعین نہیں کر سکے۔ حد تو یہ ہے کہ ہماری کوئی تعلیمی پالیسی بھی آج تک معین نہیں ہو سکی۔ اس کشتی کے ناخدا ہی نہیں عوام بھی منزل کے شعور سے بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کی مثال آج بے لنگر کے جہاز کی ہے اور پاکستانی قوم ایک کٹی ہوئی پتنگ کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ آزادی کی جو عظیم نعمت ہمیں نصف صدی قبل حاصل ہوئی تھی وہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے — ہم بہت حد تک اپنی آزادی سے خود ہی دستبردار ہو چکے ہیں اور اسے طشت میں رکھ کر اپنے امریکی آقاؤں کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں اور باقی ماندہ بچی کھچی آزادی بھی شدید طور پر معرضِ خطر میں ہے' لیکن بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ ہم اب بھی جاگنے کو تیار نہیں ہیں۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہم جب تک بحیثیت قوم اپنا قبلہ درست نہیں کریں گے اور جب تک پاکستان کی اصل منزل یعنی حقیقی اسلام کی طرف ثبت اور ٹھوس پیش رفت نہیں کریں گے' ہماری حالت کے سدھرنے کا بظاہر احوال کوئی امکان نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾

درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۶)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرَّجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ۞ وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ۚ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۞ ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖٓ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۞ وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۞ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ۞﴾ ...... (آیات ۷ تا ۱۱)

گزشتہ نشست کا قرض

سورۃ الحدید کی ان پانچ آیات پر اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ مشتمل ہے۔ اس سے قبل کہ میں ان آیات کا ترجمہ اور ان کے بارے میں کچھ وضاحت پیش کروں'

گزشتہ نشست کا جو قرض باقی رہ گیا تھا وہ ادا کر رہا ہوں۔ شیخ ابن عربی کے بارے میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک حقیقت و ماہیتِ وجود کے بارے میں ان کی رائے کا تعلق ہے' میں اس سے متفق ہوں اور میرا مسلک بھی وہی ہے۔ البتہ اور بہت سی باتیں' خواہ انہوں نے لکھیں یا ان کی طرف غلط منسوب کر دی گئیں' ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں نہ تو ان کے بارے میں جواب دہ ہوں' نہ ان کی وضاحت میرے ذمہ ہے اور نہ ہی مجھے ان کے وکیل کی حیثیت حاصل ہے۔ خود اس فلسفہ وجود کے بارے میں بھی مَیں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے نہ طریقت سے۔ اس فلسفہ کو جس کا جی چاہے قبول کرے اور جو اسے ردّ کرنا چاہے ردّ کر دے۔ اس کے نہ ماننے سے کسی اعتبار سے بھی دین میں کوئی کمی یا نقص واقع نہیں ہوتا۔ البتہ تنقید اور اختلاف کے معاملے میں دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کے نظریات پر آپ تنقید کر رہے ہیں پہلے اس کے اصل مسلک کو ضرور سمجھ لیں۔ شیخ ابن عربی کے فلسفہ وجود پر اکثر و بیشتر ناقدین' بالخصوص آج کل کے سلفی المزاج لوگ' جس انداز کی تنقیدیں کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو ان لوگوں نے اس مسئلہ کو سمجھا ہی نہیں' اور دوسرے یہ کہ جو باتیں شیخ ابن عربی نے کہی ہی نہیں وہ بھی ان سے منسوب کر دیتے ہیں۔ بہرحال اس مسئلے کو میں نے اپنے طور پر جس طرح حل کیا ہے وہ میں بیان کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت تو ہمارے لئے مطلوب و مقصود ہے اور اسی پر ہمارے طرزِ عمل اور دینی رویئے کی ساری بنیاد ہے۔ معرفتِ ربّ جس قدر گہری ہوگی اسی قدر ہمارے عمل میں گہرائی ہوگی' معرفت میں جتنی زیادہ وسعت ہوگی ہمارے دینی رویئے اور دینی روش میں بھی اتنی ہی زیادہ وسعت ہوگی۔ گویا معرفتِ ربّ اور ہمارا دینی رویہ ایک دوسرے کے ساتھ راست متناسب (proportionate) ہوں گے —— میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دو حصے ہیں: (۱) ذاتِ باری تعالیٰ' اور (۲) صفاتِ باری تعالیٰ —— ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں مَیں نے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دو مقولوں پر مشتمل ایک شعر سنایا تھا:

الــعِـجـزُ عــن دَرکِ الـذّاتِ اِدراکٌ
والبَـحـثُ عــن کُـنــہِ الذّاتِ اِشراکٌ

یعنی جب انسان کواللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا احساس ہوجائے تو بس یہی ادراک ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ میں کھود کرید کروگے تو شرک میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ گویا معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

شیخ سعدیؒ نے اس بات کوخوب بیان کیا ہے ؎

تواں در بلاغت بہ سُحباں رسید
نہ در کنہِ بے چونِ سبحاں رسید!

سُحباں ایک بہت ہی حکیم شخصیت کا نام ہے جوفصاحت و بلاغت کی معراج پر فائز تھے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ بلاغت وفصاحت اور خطابت میں تو انسان سحباں تک بھی پہنچ سکتا ہے‘ لیکن ذاتِ باری تعالیٰ سبحانہٗ کی کُنہ تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دوسرا حصہ صفات پر مشتمل ہے۔ معرفت ربّ کے بارے میں مَیں اپنی حدود و قیود (limitations) عرض کر چکا ہوں کہ ہماری ساری معرفت صفات کے حوالے سے ہے۔ ’’ایمانِ مجمل‘‘ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ

’’میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور صفات سے ظاہر ہے‘‘۔

لیکن صفات میں بھی ہم نہ اُن کی کمیت کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ کیفیت کا۔

صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارے ہاں علم کلام کا یہ مسئلہ متکلمین کے مابین ہمیشہ زیر بحث رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کا عین ہیں یا غیر؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی نظم ’’ابلیس کی مجلس شوریٰ‘‘ میں اس مسئلے کی نشاندہی کی ہے ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات؟
اُمت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذات وصفات میں کیا نسبت ہے؟ ہمارے لئے تو صفت اضافی

شے ہے۔ ایک وقت تھا کہ مجھے کچھ بھی علم حاصل نہیں تھا۔ آج مجھے تھوڑا یا زیادہ کچھ نہ کچھ علم حاصل ہے' اور ہوسکتا ہے کہ میں ارزل العمر تک پہنچ جاؤں اور وہ علم بالکل زائل ہو جائے (اعاذنا اللہ من ذٰلک) گویا کہ صفتِ علم ہمارے وجود پر ایک اضافی شے ہے' وہ ہمارے وجود کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن کیا ہم اللہ کے بارے میں یہ تصور کر سکتے ہیں؟ اس مسئلہ پر بڑی طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کا موقع ملا جو اِس دَور میں فلسفہ و منطق کے قدیم مکتب فکر ''خیر آباد اسکول آف تھاٹ'' کی آخری شخصیت تھے۔ جب میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا تھا تو وہاں میں نے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کیا اور یہ مسئلہ میری سمجھ میں آیا۔ میں یہاں وہ مسئلہ تو بیان نہیں کر رہا' لیکن اس کا سب کے نزدیک جو متفق علیہ حل ہے وہ ہے ''لا عینٌ ولا غیرٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات نہ اس کی ذات کا عین ہیں اور نہ غیر۔ سمجھ میں آئے تب بھی یہ ماننا پڑتا ہے نہ آئے تب بھی ماننا پڑتا ہے' اس لئے کہ اگر عین مانیں گے تب بھی بہت سی ایسی چیزیں لازم آ جائیں گی جنہیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اگر غیر مانیں گے تب بھی ایسی بہت سی چیزیں لازم آ جائیں گی جن کا اللہ کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ''لا عینٌ ولا غیرٌ'' کی ایک تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ''من وجہٍ عینٌ ومن وجہٍ آخر غیرٌ'' یعنی ایک اعتبار سے وہ غیر ہیں اور ایک اعتبار سے عین۔ یہ گویا دوسرا مقدمہ ہوا۔

اب آیئے تیسری بات کی طرف! ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سلسلۂ کون و مکان اللہ تعالیٰ کے ایک امر ''کُن'' کا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں دو مقامات (الکہف:۱۰۹ و لقمان:۲۷) پر آیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے کلمات کو گن نہیں سکتے۔ اگر کل روئے ارضی کے درخت قلم اور سارے سمندر سیاہی بن جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے' لیکن سیاہی ختم ہو جائے گی۔ اگر سیاہی کی اتنی ہی مقدار مزید لائی جائے تو وہ بھی اس مقصد کے لئے ناکافی ہوگی۔ ﴿لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات اللہ کے کسی نہ کسی کلمۂ

کن کا ظہور ہیں۔ اب سمجھئے کہ ''کُن'' کیا ہے؟ کلام ہے' کلمہ ہے۔ اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ گویا کہ حرفِ ''کُن'' اللہ کی صفت ہے اور صفت کے بارے میں متکلمین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ''لا عینٌ ولا غیر''۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ کائنات نہ اللہ کا عین ہے اور نہ غیر ہے' اور یہی بات ہے جو شیخ ابنِ عربی کہہ رہے ہیں:

من وجہٍ عینٌ ومن وجہٍ آخر غیرٌ

ایک اعتبار سے یہ عین ہیں اور ایک اعتبار سے غیر ہیں۔ ماہیت وجود (essential being) میں اتحاد ہے' لیکن جہاں بھی تعین ہوگا اور مختلف چیزوں کا definite وجود مان لیا جائے گا تو وہ اللہ کا غیر ہے۔ یہی مسلک ابنِ عربی کا ہے اور یہی اس مسئلے میں میری توجیہہ ہے۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے حضرات کا شاید یہ ذوق نہ ہو' اس کے باوجود میں یہ مسئلہ اس لئے بیان کر دیا کرتا ہوں کہ ان بزرگوں اور اسلاف کے بارے میں سوئے ظن نہ رہے جو وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اس سے ہمیں اپنے آپ کو بچا لینا چاہئے' کیونکہ یہ بہت بڑی محرومی ہے۔ کسی بھی شخص سے اختلاف کا حق ہر شخص کو حاصل ہے' یہاں تک کہ آراء کی حد تک ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اختلاف کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہ رائے رکھ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فلاں معاملہ میں یوں نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک عصمت خاصۂ نبوت ہے اور نبوت کے خاتمہ کے ساتھ عصمت ختم ہو چکی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اب کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔

آیاتِ زیرِ درس کا رواں ترجمہ و مفہوم

اب آیئے اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے حصے کی طرف' جو اس کے عملی پہلو پر مشتمل ہے! میں چاہتا ہوں کہ پہلے ان پانچ آیات کا ایک رواں ترجمہ سامنے آ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے پہلی ہی آیت بڑی عظمت کی حامل ہے اور ان

پانچوں کو ایک کل کی حیثیت سے سامنے رکھیں گے تو نظر آئے گا کہ جہاں ایک طرف فصاحت و بلاغت کی معراج ہے وہیں جامعیت اور اس کے ساتھ ترتیب اور توازن کی بھی انتہا ہے جو آپ کو ان پانچ آیات میں ملے گی۔ پہلی آیت کا رواں ترجمہ یوں ہوگا:

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر (یا ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر) اور خرچ کر دو (لگا دو، کھپا دو) ان سب چیزوں میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے (دین متین کے یہ دو تقاضے پورے کر دیں۔ یعنی) ایمان لے آئیں اور انفاق کا حق ادا کر دیں تو ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے''۔

ایک آیت میں جامعیت کے ساتھ دین کے جملہ تقاضوں کو دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ حسن ترتیب اور حسن توازن ملاحظہ کیجئے کہ اب ان میں سے ہر ایک تقاضے پر دو دو آیات آ رہی ہیں' ایک ایک آیت میں ذرا سرزنش' ڈانٹ ڈپٹ' زجر اور ملامت کا انداز ہے اور ایک ایک آیت میں ترغیب اور تشویق ہے۔ فرمایا:

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے درانحالیکہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اپنے رب پر ایمان رکھو اور وہ تم سے قول و قرار لے چکا ہے اگر تم واقعی مؤمن ہو''۔

اس آیت میں گویا کہ زجر و ملامت اور ایک طرح کی تنبیہہ اور سرزنش ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں تشویق و ترغیب آئی ہے کہ اگر تمہیں اپنے باطن میں جھانکنا نصیب ہو جائے' اپنے دلوں کو ٹٹولنے کی سعادت حاصل ہو جائے اور محسوس ہو کہ واقعتاً خانۂ دل ایمان سے خالی ہے تو بھی گھبراؤ نہیں۔ فرمایا:

''وہی ہے (اللہ) جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے پر روشن آیات' تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے''۔

اندھیرے شرک کے ہیں' کفر و الحاد کے ہیں' مادیت کے ہیں' حرص و ہوا کی غلامی کے ہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا!

یہ مختلف shades of darkness ہیں۔قرآن مجید میں ''ظُلُمات'' ہمیشہ جمع کے صیغہ میں اور نور ہمیشہ واحد آیا ہے۔نور کے اندر تعدد بھی لایا گیا ہے تو بھی واحد کے صیغے میں: ﴿ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ﴾ جبکہ اندھیروں کا تذکرہ بایں الفاظ فرمایا: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ﴾۔تو اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے' اس کی یہ آیاتِ بینات ہیں جو تمہیں ہر طرح کے اندھیروں سے نکال کر تمام ظلمات سے' ہر طرح کے shades of darkness سے روشنی میں لے آئیں گی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ رؤف ورحیم ہے۔وہ تم پر بہت مہربان ہے' وہ تمہارا خیر خواہ ہے' تم پر رحم فرمانے والا ہے۔

تو یہ دو آیات ہو گئیں۔اب اگلی دو آیات میں بھی یہی انداز ہے۔ان میں سے پہلی آیت میں وہی سرزنش کا اسلوب ہے۔فرمایا:

> ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (تم پر یہ بخل کیوں طاری ہو گیا؟ تم نے یہ سینت سینت کر رکھنے کی روش کیوں اختیار کر لی؟) حالانکہ آسمان و زمین کی وراثت تو اللہ ہی کے لئے ہے۔(تم سب دنیا سے چلے جاؤ گے اور یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے رہ جائے گا۔) برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا تھا۔ان کے درجات بہت بلند ہیں اُن کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق اور قتال کیا' اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

فعل وہی ہے ''اِنفاق'' یعنی جان و مال کا کھپانا' لیکن جن حالات میں کوئی شخص کر رہا ہے اس اعتبار سے اس کی قدر و قیمت میں زمین و آسمان کا فرق و تفاوت واقع ہو جائے گا۔جب دین غربت کی حالت میں ہے' پامال ہے' دین کا کوئی ساتھی نہیں' دین کا کوئی جاننے والا نہیں' از روئے حدیث نبویؐ: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْباً وَسَيَعُوْدُ غَرِيْباً كَمَا بَدَأَ' فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ)) (صحیح مسلم' کتاب الایمان) ''دین کی ابتداء حالت اجنبیت میں ہوئی اور عنقریب یہ دوبارہ ویسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتداء میں تھا۔ پس خوش خبری ہے ان اجنبیوں کے لئے''۔تو اس حالت غربت میں جنہوں نے اسلام

کا ساتھ دیا ان السّابقون الاوّلون کا اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہے اس تک وہ لوگ ہرگز نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کو غلبہ حاصل ہونے کے بعد آئے اور قتال و انفاق کیا۔ اگر وہ حسن نیت سے آئے ہیں تو اُن کے اجر و ثواب کی بھی اللہ کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے' لیکن درجے میں وہ اُن کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جنہوں نے حالتِ غربت میں اور حالتِ ضعف میں دین کا ساتھ دیا۔ ان سب سے اللہ کا بہت اچھا وعدہ ہے۔ جنت سب کو ملے گی' جو پہلے آئے ان کو بھی اور جو بعد میں آئے ان کو بھی' البتہ حسن نیت شرط ہے۔ پھر جنت کے درجات میں بھی بہت فرق و تفاوت ہوگا۔ حدیث میں آیا ہے کہ نچلے درجے والا جنتی اوپر کے درجے والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین سے آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ اس سے پہلے آیت ۴ میں الفاظ آئے تھے: ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝﴾ جبکہ یہاں فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝﴾ ''بصیر'' اور ''خبیر'' دونوں الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ قرآن مجید میں ترتیب کے لحاظ سے ''بصیر'' کو مقدم اور ''خبیر'' کو مؤخر کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ خبر اصل شے ہے' بصارت میں دھوکہ کھانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ خبیر ہے' یعنی وہ تمہارے باطن سے بھی باخبر ہے' تمہاری نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں:

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی اَجْسَادِکُمْ وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمْ' وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ)) (متفق علیہ)

''اللہ تعالیٰ نہ تمہارے تن و توش کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری صورتوں کو' بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے''۔

آیت ۱۰ اذرا طویل آیت تھی جس میں سرزنش کا انداز تھا' اب اگلی آیت میں جو ترغیب کا انداز ہے واقعہ یہ ہے کہ غالب کے اس شعر کے بالکل مصداق ہے کہ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دینے کی ہمت کرے؟ پھر وہ اس کو اس کے لئے بڑھاتا رہے گا اور اس کے لئے بہترین اجر ہے''۔

دنیا میں تمہارا قرضِ حسنہ کا تصور یہ ہے کہ صرف اصل زر واپس آئے گا' مزید کچھ نہیں ملے گا' لیکن تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اس کو بڑھاتا رہے گا اور انفاق کرنے والے کو اصل مال تو بڑھ کر دوگنا' چوگنا' سوگنا' بلکہ سات سوگنا تک ملے گا ہی' بہترین اجر وثواب اضافی طور پر اس کے علاوہ ہوگا۔

یہ پانچ آیات ہیں جن پر اس سورۂ مبارکہ کا حصہ دوم مشتمل ہے' جس میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت فصاحت' بلاغت' خطابت اور غایت درجہ جامعیت اور حسن ترتیب اور حسن توازن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں جو ترتیب اور توازن موجود ہے واقعہ یہ ہے کہ میرے علم کی حد تک اس کی کوئی دوسری نظیر قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

دعوتِ ایمان کے مخاطب کون؟

اب ہم ان آیات کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلی آیت میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خطاب کس سے ہو رہا ہے؟

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُس میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور انفاق کریں ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے''۔

اگر صرف اس آیت کے الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو امکان موجود ہے کہ یہ خطاب غیر مسلموں' یہود و نصاریٰ وغیرہ سے ہو' لیکن سیاق وسباق سے اور پوری پانچ آیات کے مطالعہ سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں اُن سے خطاب نہیں ہے' بلکہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ ان سورتوں کا مجموعی تعارف کراتے ہوئے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ان سورتوں میں کفار و مشرکین' یہود و نصاریٰ وغیرہ سے خطاب ہے ہی نہیں' بلکہ روئے سخن کلیتہً مسلمانوں سے ہے۔

اب دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کون لوگ اس کے مخاطب ہیں؟ وہ لوگ کہ جن کی حرارتِ ایمانی میں کچھ کمی ہے' معیارِ مطلوب پر نہیں ہے' جن کا جذبۂ انفاق جتنا ہونا چاہئے اتنا نہیں ہے' جن کا جوشِ جہاد اور ذوقِ شہادت جتنا ہونا چاہئے اتنا نہیں ہے' جن میں ضعف ہے اور ایمان اور اعمالِ صالحہ کا جو درجہ مطلوب ہے اس پر پورے نہیں اترتے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن سے یہ خطاب کیا جا رہا ہے۔ اسی لئے ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے دو ترجمے ہوں گے: ایک یہ کہ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر'' اور دوسرا یہ کہ ''ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر''۔ پہلے ترجمے میں یہ امکان موجود ہے کہ گویا کفار و مشرکین سے خطاب ہو رہا ہے' جبکہ دوسرے ترجمہ میں خطاب گویا مسلمانوں سے ہے۔ میرے نزدیک درحقیقت یہاں خطاب ان کمزور اور ضعیف مسلمانوں سے ہے جن کے اندر حرارتِ ایمانی' جذبۂ جہاد اور جوشِ انفاق جتنا ہونا چاہئے نہیں ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں اس آیت کی ہم مضمون آیات کون سی ہیں۔ سب سے پہلے سورۃ النساء کی یہ آیت ملاحظہ کیجئے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (آیت ۱۳۶)

''اے اہل ایمان! ایمان لاؤ (یا ایمان رکھو) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اس سے پہلے نازل فرمائی تھی۔''

یعنی اے اہل ایمان! ایمان کا حق ادا کرو..... اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! ویسے مانو جیسے ماننے کا حق ہے..... اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ اور ایمان پختہ رکھو اللہ اور اس کے رسولؐ پر..... الخ

سورۃ الصف ہمارے منتخب نصاب کے حصہ چہارم کا مرکزی درس ہے۔ اس کی آیات ۱۰'۱۱ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''اے اہل ایمان! کیا تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان رکھو (یا ایمان لاؤ) اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔''

گویا کہ مخاطب بھی وہ ہیں جن کو ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کہا گیا اور انہیں حکم بھی ایمان لانے کا دیا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں تیسرا مقام سورۃ الحجرات (آیات ۱۴'۱۵) کا ہے' جہاں یہ مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے منتخب نصاب کے حصہ سوم کی آخری سورت ہے۔ فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (ہم مسلمان ہو گئے' ہم نے اطاعت قبول کر لی) جبکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اور وہ حقیقی ایمان جسے اللہ کے ہاں تسلیم کیا جائے گا' وہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اگلی آیت میں آ گئی۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾ (آیت ۱۵)

''حقیقی مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' پھر ہرگز شک میں نہیں پڑے (انہیں یقین کی کیفیت حاصل ہو گئی) اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی ہیں جو (اپنے

دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

یہاں درحقیقت ایمانِ حقیقی کے دو اجزاء بیان کئے گئے ہیں: ایک یقین قلبی اور دوسرا عمل میں جہاد اپنے جان و مال کے ساتھ۔ اس یقین کے بارے میں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

تو یہاں (سورۃ الحدید میں) درحقیقت اسی ایمانِ حقیقی کا ذکر ہے: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یعنی ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جیسا کہ ایمان کا حق ہے۔

''اِنفاق'' کا جامع مفہوم

اس کے بعد دین کا دوسرا تقاضا ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ ''اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے''۔ اس آیت میں چونکہ بہت مختصر الفاظ میں بات آ رہی ہے لہٰذا انفاق کے ساتھ ''فی سبیل اللہ'' مذکور نہیں' بلکہ مقدر (understood) ہے۔ اصل انفاق جو مقصود ہے وہ فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اسے اگلی آیت میں کھول دیا گیا: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟'' انفاق سے عام طور پر مال کا خرچ کرنا مراد لیا جاتا ہے' حالانکہ یہ لفظ وسیع المفہوم ہے۔ اس کی بحث سورۃ المنافقون میں ہو چکی ہے کہ نَفَقَ ۔ یَنْفُقُ جب ثلاثی مجرد سے آتا ہے تو اس کے معانی کسی چیز کے ختم ہو جانے' کھپ جانے اور صرف ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ جاندار اور بے جان سب کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں کہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ (درہم ختم ہو گئے) اور نَفَقَ الْفَرَسُ (گھوڑا مر گیا)۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی جس حدیث میں آنحضور ﷺ نے جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی شخص کے اعمالِ صالحہ کے پلڑے میں کسی شے کا وزن اس گھوڑے یا سواری سے بڑھ کر نہیں ہو گا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے کام آ گئی'

وہاں بھی لفظ ''نُفِقَ'' آیا ہے۔ گویا یہ لفظ بے جان اور جاندار دونوں کے لئے آتا ہے چنانچہ یہاں انفاقِ مال اور انفاقِ نفس دونوں مراد ہیں۔ انفاقِ نفس یہ ہے کہ آپ اپنی صلاحیت وقوت' محنت اور وقت صرف کر رہے ہیں۔ ایک انفاقِ مال ہے' کہ اللہ کے دیئے ہوئے وسائل آپ اس کی راہ میں خرچ کر رہے ہیں۔ لیکن دونوں پر اس لفظ ''انفاق'' کا اطلاق ہوگا۔ انفاقِ جان کی بلند ترین منزل قتال ہے جب انسان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے۔ جو جنگ میں جاتا ہے موت کا خطرہ مول لے کر جاتا ہے۔ اگر لوٹ آئے تو گویا اسے ایک نئی زندگی ملی ہے' ورنہ جنگ میں جانے والا تو دراصل اپنی جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کر کے گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں انفاق اور قتال دونوں لفظ آ گئے: ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ''برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے قبل انفاق کیا اور قتال کیا''۔ یہاں ''انفاق'' مال خرچ کرنے کے لئے اور ''قتال'' بذلِ نفس کے لئے آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے جو عہد نامہ معین کیا ہے اس میں ''وَاُنْفِقَ مَالِيْ وَاَبْذُلَ نَفْسِيْ'' کے الفاظ شامل کئے ہیں۔ اس عہد نامہ کے پہلے حصے میں تو کلمۂ شہادت اور استغفار ہے۔ دوسرے حصے میں جو عہد ہے وہ بھی تنظیم سے نہیں ہے' نہ مجھ سے کوئی معاہدہ ہے' بلکہ اللہ سے ایک عہد ہے' اس لئے کہ یہ بیع وشراء تو اللہ اور بندے کے درمیان ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ''اللہ نے خرید لئے ہیں اہل ایمان سے اُن کے مال بھی اور اُن کی جانیں بھی جنت کے عوض۔'' چنانچہ تنظیم کے ''عہد نامۂ رفاقت'' کا دوسرا حصہ یہ ہے:

اِنِّيْ اُعَاهِدُ اللّٰهَ عَلٰى اَنْ اَهْجُرَ كُلَّ مَا يَكْرَهُهُ وَاُجَاهِدَ فِيْ سَبِيْلِهٖ جُهْدَ اسْتِطَاعَتِيْ ' وَاُنْفِقَ مَالِيْ وَاَبْذُلَ نَفْسِيْ لِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ وَاِعْلَاءِ كَلِمَتِهٖ

''میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دوں گا جو اسے ناپسند ہے' اور

اپنی استطاعت کی حد تک اس کی راہ میں جہاد کروں گا' اور اپنا مال بھی خرچ کروں گا اور اپنی جان بھی کھپاؤں گا اس کے دین کو قائم کرنے کے لئے اور اس کے کلمہ کی سربلندی کے لئے''۔

اس کے بعد یہ الفاظ آتے ہیں:

وَلِاَجْلِ ذٰلِکَ اُبَایِعُ .....

''اس مقصد کی خاطر میں بیعت کر رہا ہوں.....''

اس مقصد کے لئے تنظیم میں شمولیت ہو رہی ہے' ورنہ یہ عہد معاہدہ' یہ قول و قرار' یہ میثاق اور یہ بیع و شراء تو ہر بندۂ مؤمن کا' اگر وہ حقیقتاً مؤمن ہے' اللہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اگر نہیں ہے تو یہ ہماری محرومی ہے۔

انفاق کتنا کیا جائے؟

اب اس آیت میں تیسری بات نوٹ کیجئے کہ ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ ﴾ میں لفظ ''مِمَّا'' مِنْ اور مَا سے بنا ہے' اور مِنْ یہاں تبعیضیہ ہے۔ اللہ کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ اپنا سارا مال لگا دو۔ اللہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنے جسم اور جان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری راہ میں لگا دو' بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جن جن چیزوں میں ہم نے تمہیں استخلاف عطا کیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں لگاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''کتنا؟'' اس کا جواب سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ ''(اے نبیؐ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو''۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ بندۂ مؤمن اگر اس تقاضے کو واقعتاً کما حقہٗ ادا کرنا چاہتا ہے تو اس ضمن میں وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرے! پہلے اپنی نیتوں کو صاف کیجئے' خالص کیجئے کہ جو بات سامنے آئے گی اس پر اگر دل گواہی دے گا کہ واقعتاً صحیح ہے تو قبول کریں گے۔ میرے نزدیک یہاں مِنْ تبعیضیہ اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ بندۂ مؤمن اپنے جان اور مال' اپنی صلاحیت' قوت' اوقات اور اپنی ذہانت و فطانت میں سے صرف اتنا حصہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے وقف کرے جو اُن کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے

لئے لازم ہے' جسے آپ subsistence level کہتے ہیں' اور وہ بھی اس لئے کہ زندہ رہنا ہے تا کہ ہم کام جاری رکھ سکیں۔ زندگی برائے زندگی نہیں' زندگی بجائے خود مطلوب و مقصود نہیں ہے' مطلوب و مقصود تو اللہ ہے۔ **لا مقصودَ الا اللّٰہ اور لا مطلوبَ الا اللّٰہ**۔ لیکن زندگی کو برقرار رکھنا ہے کہ یہ اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے' اور اس لئے برقرار رکھنا ہے تا کہ اللہ کی راہ میں' اس کے دین کی اقامت اور سربلندی کے لئے' زمین پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کو بالفعل قائم کرنے کے لئے مسلسل محنت اور جدوجہد کی جا سکے۔ سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول میں متعدد بار بیان کر چکا ہوں کہ ''جو دم غافل سو دم کافر''۔ یعنی جو وقت اللہ کی یاد سے غفلت میں بیت گیا وہ گویا حالتِ کفر میں گزر گیا۔ اسی طرح جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہے اسے جمع کرنا حقیقت کے اعتبار سے کفر اور ضلالت ہے۔ سورۃ الھمزۃ ابتدائی مکی دَور کی سورت ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۞ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۞ يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۞﴾ یعنی تباہی ہے' ہلاکت ہے' بربادی ہے' وَیل ہے ان لوگوں کے لئے جو ایک طرف اس اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں کہ لوگوں کی عیب چینی اور عیب جوئی کرتے ہیں' طنز و طعن کا کام کرتے ہیں اور دوسری طرف مال جمع کرتے ہیں اور اسے گنتے رہتے ہیں' اپنی مالی حیثیت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ آج کی بیلنس شیٹ کیا ہے اور اس سال ہمارے اثاثوں (assets) میں کتنا اضافہ ہوا۔ ان کے دل کی کلی اسی سے کھلتی ہے۔ وہ یوں محسوس کرتے ہیں شاید اسی مال کی بدولت انہیں خلد اور دوام حاصل ہو جائے گا۔ ان تین آیات میں ایک پوری انسانی شخصیت کا ہیولیٰ اور ایک پوری ذہنیت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے۔

مدنی قرآن میں انتہائی زمانے کی سورۃ التوبۃ کی آیات ۳۴'۳۵ ملاحظہ کیجئے:

﴿وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۞ يَّوۡمَ يُحۡمٰى عَلَيۡهَا فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكۡوٰى بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَجُنُوۡبُهُمۡ وَظُهُوۡرُهُمۡ ؕ هٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ ۞﴾

یعنی جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے' اے نبی انہیں بشارت دے دیجئے دردناک عذاب کی۔ (طنز کیا گیا ہے کہ انہیں بشارت دے دیجئے)۔ ایک دن آئے گا کہ یہی سونا چاندی جہنم کی دہکتی آگ میں تپا تپا کر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا' لو اَب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو!

تو مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ سمجھ کر آسانی سے نہیں گزر جانا چاہئے' بلکہ یہ بڑا فکر انگیز مقام ہے۔ ہاں' آدمی کی ضروریات کتنی ہیں' یہ معاملہ ہر شخص پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لئے اس کا تعین خود کر لے۔ یہ اس کی اپنی assessment ہے۔ مختلف ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے حوالے سے سب کی ضروریات برابر نہیں ہوتی۔ ایک چیز ایک شخص کے لئے luxury ہے' لیکن ہو سکتا ہے کہ دوسرے شخص کے لئے وہی چیز necessity ہو۔ اس اعتبار سے کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ ہر شخص اپنا جائزہ لے لے کہ درحقیقت ان تمام چیزوں میں سے جو اللہ نے اسے عطا کی ہیں' اس قدر جتنا زندگی کے لئے' جسم اور جان کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے ناگزیر ہے وہ تو اس کا صحیح اور جائز حق ہے' اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا تھا۔

جو حرفِ قُلِ العَفْو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

واقعہ یہ ہے کہ دین کی بہت سی باتوں پر بہت گہرے اور دبیز پردے پڑ گئے ہیں۔ آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا وہ قول سن رکھا ہو گا کہ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وِعَائَیْنِ ..... حضرت ابو ہریرہؓ کا انتقال سن ۵۷ یا ۵۸' یا زیادہ سے زیادہ ۵۹ ہجری میں حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت میں ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی انقلابِ حال اس درجے ہو چکا تھا کہ فرماتے تھے:

حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وِعَائَيْنِ ' فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِيْكُمْ ' وَاَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ (صحیح البخاری' کتاب العلم' باب حفظ العلم)

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے (علم کے) دو برتن حاصل کئے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کیا ہے' لیکن اگر دوسرے میں سے پھیلانا شروع کر دوں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی''۔

اس درجے انقلاب اُس وقت آ چکا تھا اور لوگوں کی سوچ میں اس قدر تبدیلی آ چکی تھی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا ایک اور واقعہ بھی ہے کہ دِمشق کی جامع مسجد سے نکلے اور ناک صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی تو رومی کتان' جو بہت قیمتی کپڑا ہوتا تھا' اس کا رومال نکالا اور ناک صاف کر کے پھینک دیا اور پھر خود ہی کہنے لگے: اے ابو ہریرہ! آج تمہارا حال یہ ہے' اور وہ دن بھی تھے جب تم پر فاقوں کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاید مرگی کا دورہ پڑا ہے' تو پاؤں رکھ کر تمہاری گردن دباتے تھے۔ اصحابِ صُفہ کا دَور عسرت اور تنگ دستی کا دَور تھا۔ بعد میں فتوحات کے نتیجے میں دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ ظاہر بات ہے کہ جب اس طور سے دنیا عام ہوئی تو پھر لوگوں کے اندازِ فکر میں بھی تبدیلی آ گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ((لَا اَلْفَقْرُ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ.....)) ''اے مسلمانو! مجھے تم پر فقر اور احتیاج کا کوئی خوف نہیں ہے (فقر اور احتیاج میں تو اللہ یاد آتا ہے' اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔) مجھے اندیشہ ہے تو اس کا کہ دنیا کے خزانے تمہارے پاؤں میں آئیں گے اور پھر تم اس دنیا کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹو گے''۔

ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ ''اور انفاق کرو اس میں سے جس پر اللہ نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے''۔ یہ الفاظ اس اعتبار سے بھی فکر انگیز ہیں کہ ان میں ہماری حیثیت معین کی گئی ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ تمہیں خلافت دی گئی ہے' اپنے آپ کو مالک نہ سمجھ بیٹھنا۔ نہ تم مَلِک ہو نہ مالِک ہو' مالک حقیقی بھی اللہ اور مَلکِ حقیقی بھی وہی

ہے۔ تمہیں تو خلافت دی گئی ہے' تم نائب ہو' تم custodian ہو' تم امین ہو' تم اللہ کے حکم کی تنفیذ کرنے والے ہو۔ یہ مفہوم لفظ ''استخلاف'' میں پنہاں ہے۔ پھر یہاں اسم مفعول کا صیغہ ''مُسْتَخْلَف'' آیا' کہ یہ خلافت بھی تم نے خود حاصل نہیں کی ہے' بلکہ اللہ نے تمہیں عطا کی ہے۔ مزید یہ کہ ﴿ مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ میں ''مُسْتَخْلَفِيْنَ'' مفعول بہ بن کر آیا ہے' یعنی تم مجعول ہو۔ درحقیقت تمہاری تو کوئی حیثیت ہے ہی نہیں' اس نے تمہیں بنایا ہے خلافت دیئے ہوئے (مُسْتَخْلَفِيْنَ) اُن چیزوں میں جو کہ اس نے تمہیں دی ہیں۔ ان میں تمہارا جسم ہے' تمہاری توانائی ہے' تمہاری ذہانت و فطانت ہے' تمہاری دُور بینی اور دُور اندیشی ہے' تمہارا وقت ہے' تمہاری صحت ہے' تمہاری قوتِ کار ہے' تمہاری عمر ہے' خاص طور پر تمہاری جوانی کی عمر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور ابنِ آدم کے قدم اُس وقت تک اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے:

عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ؟ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ؟ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ اَنْفَقَهٗ؟ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ؟ (سنن الترمذی' فی صفة القیامة' باب ۱)

''(۱) اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں گنوائی؟ (۲) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کہاں لٹائی؟ (۳) اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا؟ (۴) اور کہاں خرچ کیا؟ (۵) اور جو علم حاصل کیا اس پر کتنا کچھ عمل کیا؟''

دیکھئے عمر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں دو سوال ہیں۔ ''جو عمر ہم نے تمہیں دی تھی وہ کہاں گنوائی؟ اور خاص طور پر جوانی کہاں لگائی؟'' معلوم ہوا کہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو اللہ نے ہمیں دی ہیں اور اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب چیزوں میں سے اس کی راہ میں انفاق کریں۔ اس آیت پر ابھی مزید گفتگو اگلی نشست میں جاری رہے گی۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

علامہ اقبال کی نظر میں عورت کا مقام

تحریر: سیدہ نغمہ زیدی☆

عورت نام ہے ایک حسین شعریت کا' روحانی قلب وسکون کا' جس کا مسلک وفاداری' جس کا مذہب محبت اور جس کا فرض انسان سازی ہے۔ وہ امتزاجِ رنگ ونغمہ کا ایک مجسمہ ہے جو باصرہ نواز بھی ہے اور سامعہ پرور بھی۔ اس کا خمیر مشامِ جاں اور حریرو پرنیاں سے ترکیب پاتا ہے جس کا شامہ حیات زا اور لمس لطافت آفرین ہے۔

دنیا کی کسی زبان کو لے لیجئے۔ اس کے لٹریچر کا موضوع غالب عورت ہی ملے گا' اور ادب پر کیا منحصر تمام فنونِ لطیفہ کا دراصل مرکز ثقل ہی عورت ہے۔ بابل کی تہذیب یونان سے بھی پرانی ہے' لیکن اس عہد عتیق کی وہ تنہا داستان ایک عورت ''زہرہ'' ہی کا فسانہ ہے۔ مصر قدیم سے کبھی قلوپطرہ کے نام کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ورجل اور دانتے یورپ کے مشہور شعراء ہیں' لیکن ورجل کی تخلیق شعری میں عورت کس قدر غالب ہے! مغربی مصوروں لینارڈو اور رفائیل کے شہرۂ آفاق تصویری شاہکار مونالیزا اور لاولٹا عورتیں ہی تھیں۔ جذبات کی دنیا میں مغرب نے ہمیشہ مشرق کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ مشرق میں کون ہوگا جسے لیلیٰ' شیریں اور سلمیٰ کے نام ازبر نہ ہوں! خود ہندوستان اپنی سیتا' رادھا' درویدی' ہیر' سوہنی کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

لیکن وہ عورت جس سے مَرد کی زندگی مفہوم پاتی ہے اور جس پر کارخانۂ عالم کی اساس ہے' روزِ اوّل سے لے کر موجودہ مہذب دنیا تک اسے ایک بُت کی مانند پوجا تو گیا' لیکن عموماً اسے مَرد کے مقابلے میں کمتر اور اَخلاقی' دماغی اور معاشرتی حیثیت میں

☆اسسٹنٹ پروفیسر' جناح کالج فار ویمن' پشاور یونیورسٹی' پشاور

مَرد سے بدرجہا پست سمجھا جاتا رہا ہے۔ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون نے عورت کا شمار بچوں اور غلاموں کے ساتھ کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ زندگی کے تمام میدانوں میں وہ مَرد سے بہت پیچھے ہے۔ رومن قانون میں عورت مَرد کی زرخرید کنیز تھی۔ وہ ادائے شہادت کے قابل نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کا مال ومتاع شوہر کی ملکیت ہو جاتا تھا۔ بدھوں کے نزدیک عورت اُن تمام مکر وفریب کے جالوں میں سے جو شیطان نے انسان کے لئے پھیلا رکھے ہیں' سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ عیسائی مذہب کے پادری طرطولیان عورت کو برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: ''تم شیطان کا دروازہ ہو' تم نے خدا کی شبیہہ کو مٹا دیا''۔ یہی نہیں' بلکہ ۵۸۶ء میں میکن کی کونسل کے اجلاس میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا کہ عورت کا شمار بنی نوعِ انسان میں بھی ہے یا نہیں؟ برصغیر کے طول وعرض میں ہندوؤں نے اس صنف نازک پر جو ظلم روا رکھے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ ویدوں کے احکام کے مطابق عورتیں مذہبی کتابوں کو نہیں چھو سکتیں۔ ایسٹر مارک رقم طراز ہیں: ''اگر کوئی عورت' کتا یا شودر کسی متبرک بُت کو چھو لے تو اس بُت کی اُلوہیت تباہ ہو جاتی ہے''۔ عورت کو غلام سے بھی کمتر درجہ دیا گیا۔ شوہر کے مرنے کے بعد اسے زندہ نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا' بلکہ ستی کی رسوائے زمانہ رسم آج بھی کئی علاقوں میں جاری ہے۔

اہل عرب عورت کے وجود کو موجب ذلت وعار سمجھتے تھے۔ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ قیس بن عاصم نے آٹھ دس لڑکیاں دفن کی تھیں۔ اسلام کے آنے سے پہلے دنیا نے عورت کو ایک غیر مفید بلکہ مخل تمدن عنصر سمجھ کر میدانِ عمل سے ہٹا دیا تھا۔ اسلام نے دنیا کی اس روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بتایا کہ زندگی مَرد اور عورت دونوں ہی کی محتاج ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۞ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۞﴾ (التکویر:۸'۹)

''جب کہ زندہ درگور لڑکی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں ماری گئی''۔

دنیا نے عورت کو منبع معصیت اور مجسم پاپ اور گناہ سمجھ رکھا تھا' مگر افضل الانبیاء ختمی

مرتبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنیَا النِّسَاءُ وَالطِّیبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوةِ)) (۱)

''دنیا (کی چیزوں) میں مجھے عورت اور خوشبو پسند ہے (لیکن) میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے''۔

غرض اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے چودہ سو سال قبل عورت کو مرد کے برابر حقوق اُس وقت دیئے جب عورت کے حقوق کا تصور ابھی دنیا کے کسی معاشرے میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن دنیائے شاعری میں عورت کو کبھی وہ مقدس و محترم مقام نصیب نہیں ہوا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ اردو اور فارسی شعراء ہمیشہ اسے ایک محبوبہ یا بازاری عورت کے روپ میں پیش کرتے رہے۔ مولانا حالی نے پہلی بار اردو شاعری کو اس کے روایتی انداز سے نکالا اور اس میں جدیدیت کا رنگ بھر کر تنگنائے غزل کو وسعت بخشی اور غزل کا تصور عملی زندگی سے ہمکنار ہوا۔ حالی کی شاعری میں پہلی مرتبہ عورت ایک محبوبہ کے روپ سے نکل کر ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی معزز حیثیت میں نمودار ہوئی۔ حالی کے بعد اقبال ہمارے دوسرے عظیم شاعر ہیں جنہوں نے عورت کی عظمت اور وقار کو اپنی شاعری میں بلند درجہ دیا ہے۔ وہ اپنی بیاض میں فرماتے ہیں:

''وہ عورت جو کمالِ حسن کے باوصف پندارِ حسن سے مطلق مبرا ہو میرے نزدیک خدا کی تمام مخلوقات میں دلکش ترین شے ہے''۔

علامہ اقبال نے اپنی کئی تصانیف مثلاً رموزِ بے خودی، جاوید نامہ، ضربِ کلیم، بانگ درا اور ارمغانِ حجاز میں اس موضوع پر بڑے مدلل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، بلکہ اپنے مقالات، خطوط اور مختلف خطبات میں بھی موقع بہ موقع اس موضوع پر بحث کی ہے۔ ''رموزِ بے خودی'' جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی، اس کے آخر کے تین باب عورت ہی کے ضمن میں لکھے گئے ہیں۔ اقبال ''خطاب بہ مخدراتِ اسلام'' کے عنوان کے تحت عورتوں کی قدر و منزلت کو ناصحانہ پیرائے میں یوں بیان کرتے ہیں:

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما

(۱) مسند احمد، کتاب باقی مسند المکثرین، باب باقی المسند السابق۔

طینتِ پاکِ تو ما را رحمت است　　قوتِ دین و آسائش ملت است
کودکِ ما چون لب از شیر تو شست　　لا الٰہ آموختی او را نخست
می تراشد مہرِ تو اطوارِ ما　　فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما

یعنی اے عورت! تیری چادر ہماری عزت کی محافظ ہے اور تیرا ہی نور ہماری فانوس یعنی ہماری زندگی کا حقیقی سرمایہ ہے، تو نہ ہوتی تو نہ ہماری زندگی ہوتی اور نہ ہی زندگی کی یہ رونق ہوتی۔ تیری ہستی اور تیری پاک طینت ہماری قوم کی بنیادوں کو مضبوط کرنے والی اور ہمارے لئے باعث رحمت ہے۔ ہماری ملت وقوم کے بچوں نے جوں ہی اپنے ہونٹوں کو تیرے شیر سے تر کیا تو نے سب سے پہلے انہیں توحید کا سبق سکھایا۔ تیری محبت کے سانچے میں دراصل ہماری گفتار اور کردار ڈھلتے ہیں۔

گویا اردو شاعری میں پہلی بار اقبال نے عورت کی عزت وحرمت اور قدر ومنزلت کو بیان کیا کہ عورت ہی وہ ذات ہے جو قوموں کی سیرت کی تعمیر کرتی ہے اور عورت ہی کی پیشانی کے خط میں ہماری قومی تقدیر پوشیدہ ہے۔ اقبال کے نزدیک عورت کا اہم ترین منصب ماں ہے، کیونکہ اس پر نسل انسانی کی بقا کا انحصار ہے۔ وہ ماں جو حسن سیرت کا مجموعہ ہو اپنی اولاد کو بھی حسن سیرت کے سانچے میں ڈھال کر اُس کو قوم وملت کے لئے سرمایۂ فخر بنا دیتی ہے۔ ماں کی حیثیت میں عورت کی عزت وتکریم کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے''۔ اسی لئے اقبال بھی عورت کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

نیک اگر بینی امومت رحمت است　　زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است　　سیرتِ اقوام را صورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیر ما　　در خط سیمائے او تقدیر ما
از امومت گرم رفتارِ حیات　　از امومت کشفِ اسرارِ حیات

گویا علامہ اقبال کی نظر میں عورت کی عظمت کا راز اس کے فرضِ امومت کی ادائیگی میں ہے۔ جس قوم کی عورتیں فرائض امومت سے کترانے لگتی ہیں، اس کا

معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مغربی تمدن کی اقدارِ عالیہ کو اسی لئے زوال آ گیا ہے کہ وہاں کی عورت آزادی کے نام پر جذبۂ امومت سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ اقبال نے یورپ کے اس رجحان کی سخت مذمت کی ہے، جس کے تحت عورت صرف فیشن کا پتلا بننے ہی کو اپنا کمال سمجھتی ہو، پھر شمعِ محفل بن کر رقص و سرود کی محفلوں کو گرماتی ہو، یا پھر سوسائٹی گرل بن کر زندگی گزارنے ہی کو وہ بہترین زندگی سمجھتی ہو اور ماں بننے سے کوسوں دُور بھاگتی ہو۔ ایسی عورت کو اقبال معاشرے کے لئے ایک بدنما داغ تصور کرتے ہیں۔

''جاوید نامہ'' میں وہ عورت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ایک دوسرے انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں وہ ہفت افلاک کی سیر کرتے ہیں اور فلک مریخ پر وہ ایک ایسی دوشیزہ کی گفتگو سنواتے ہیں جو دعوائے نبوت کرتی ہے اور خواتین کے لئے گمراہ کن پروپیگنڈہ کرتی ہے۔ اقبال سب سے پہلے اس کی کیفیت اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

چہرہ اش روشن ولے بے نور جان
معنیٔ او بر بیانِ او گران
حرفِ او بے سوز و چشمش بے نمی
از سرورِ آرزو نامحرمی
بے خبر از عشق و از آئینِ عشق
صعوۂ رو کردۂ شاہینِ عشق

[اس کا چہرہ روشن تھا مگر روحانی نور سے محروم۔ وہ حرفِ مدعا لب پر واضح طور پر نہ لا سکتی تھی۔ اس کی باتیں بے سوز اور اس کی آنکھیں بے نم تھیں۔ سرورِ آرزو کی اسے خبر نہ تھی۔ وہ عشق اور آدابِ عشق سے بے بہرہ تھی۔ وہ ایک مولے کی طرح تھی جسے عشق کے شاہین نے بھگا دیا ہو۔]

اس دوشیزہ کو علامہ نے فلک مریخ کی نبیہ کا نام دیا ہے اور اس کی تبلیغ کو یوں بیان کیا:

اے زنان! اے مادران! اے خواہران
زیستن تا کی مثالِ دلبران
دلبری اندر جہان مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است
از امومت زرد روی مادران
اے خنک! آزادیٔ بے شوہران

[اے عورتو! اے ماؤں! اے بہنو! (مرد کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ کر اس کی) محبوبہ بن کر جینا بھی کوئی جینا ہے؟ دنیا کے اندر اس طرح محبوبہ (بیوی) بن کر رہنا تو مظلوم بن کر رہنا ہے۔ یہ تو محکومی اور محرومی کی زندگی ہے۔ (تم امومت کا بار نہ اٹھانا' کیونکہ) ماں بننے سے عورت کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔ بے شوہر عورتوں کی آزادی کتنی مبارک ہے!]

لیکن اقبال جدیدیت کے اس رجحان کو خلافِ فطرت قرار دیتے ہیں اور ہر وہ عمل جو انسانی فطرت کے تقاضوں کے خلاف ہو' اُسے مذموم اور قبیح خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس تہذیب جدید کی دلدادہ دوشیزہ کی باتوں کا جواب یوں دیتے ہیں:

زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست؟
عشق یک بین در تماشائے دوئی است
مَرد و زن وابستۂ یک دیگر اند
کائناتِ شوق را صورت گر اند!

[اے زندہ دل! کیا تو جانتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ یہ دوئی میں ایک کو دیکھنے کا یعنی کثرت میں وحدت کے تماشے کا نام ہے۔ مَرد اور عورت ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور کائناتِ شوق کی صورت گری کرتے ہیں!]

اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی آزادی کی تحریک اور ان کی سوچ غلط راستے پر پڑ گئی ہے۔ عورتوں کی بے راہ روی پوری قوم کی تباہی اور بربادی ہے۔ ان کی بے جا آزادی سے جرائم بڑھتے ہیں اور معاشرہ آوارہ اور بدکار ہو جاتا ہے۔ اقبال کو اِس

آزادی کے نظریئے سے اختلاف ہے۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

''اگر عورت کو اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مَرد انجام دے سکتا ہے' تو یہ طریقہ کار یقیناً غلط ہوگا' مثلاً عورت کو جس کا اصلی کام آئندہ نسل کی تربیت ہے' ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے' بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے''۔

چنانچہ ''رموزِ بےخودی'' میں فرماتے ہیں:

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر
نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست
تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظِ رمزِ اخوت مادران
قوتِ قرآن و ملت مادران

[اے صاحب نظر! قوم کا حقیقی سرمایہ روپیہ پیسہ' مال و متاع اور سونا چاندی نہیں ہے' بلکہ اس کا سرمایہ تو تندرست نوجوان ہیں جو تازہ دماغ' محنت کرنے والے اور چاق و چوبند ہوں۔ بھائی چارے کی حقیقت کی محافظ تو مائیں ہیں۔ قرآن اور ملت کی اصل قوت مائیں ہیں۔]

عزیز احمد ''اقبال: نئی تشکیل'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک مَرد اور عورت دونوں مل کر کائناتِ عشق کی تخلیق کرتے ہیں۔ عورت زندگی کی آگ کی خازن ہے' وہ انسانیت کی آگ میں اپنے آپ کو جھونکتی ہے اور اس آگ کی تپش سے ارتقاء پذیر انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اس عشق میں جو صلاحیت تخلیق اور ذوقِ تخلیق حیات نے عورت کو عطا کیا ہے اقبال کے خیال میں اس کی وجہ سے خلوت لازم آتی ہے۔ یہی حجاب کا راز ہے جو اقبال کے نزدیک پردے کا جواز ہے''۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال مَردوں کو تو اثباتِ خودی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن

عورتوں کو اس کا موقع نہیں دیتے کہ وہ آزادی حاصل کر کے اپنی خودی کا اثبات کر سکیں۔ دراصل اقبال آزادیٔ نسواں کے اس حد تک قائل ہیں جس حد تک اسلام عورتوں کی آزادی کی ایک محدود اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ اقبال ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''کہ بموجب آیۂ کریمہ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ میں مَرد اور عورت کی مطلق مساوات کا حامی نہیں ہو سکتا' کیونکہ قدرت نے ان دونوں یعنی مَرد اور عورت کے تفویض جدا جدا خدمتیں کی ہیں۔ عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی''۔

گویا جب عورت پردے سے باہر آ جاتی ہے تو وہ زیب و زینت' ذہنی پراگندگی' جھوٹی نمائش اور بے باکی و بے حیائی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک عورت کے ذاتی جوہر خلوت میں کھلتے ہیں' جلوت میں نہیں۔ ''خلوت'' کے نام سے ایک نظم میں کہتے ہیں:

رسوا کیا اس دَور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ' آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر!

وہ اپنے ایک مضمون ''قومی زندگی'' میں پردے کے متعلق فرماتے ہیں:

''چونکہ اقوامِ ہندوستان نے اَخلاقی لحاظ سے بہت کچھ ترقی نہیں کی ہے اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لئے نہایت مضر ہوگا''۔

اقبال کے نزدیک مَرد اگر صاحب غیرت ہے تو وہ عورت کی صحیح محافظت کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ اگر مَرد میں غیرت نہ ہو تو عورت کی حفاظت نہ پردہ کر سکتا ہے

اور نہ ہی عورت کا عورت پن اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ ''ضربِ کلیم'' میں فرماتے ہیں:

اک زندہ حقیقت ہے مرے سینے میں مشہود
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مَرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

علامہ اقبال عورت کے لئے مغربی تہذیب اور تعلیم کو بھی بھیانک تصور کرتے ہیں۔ ''بانگ درا'' میں لڑکیوں کے مغربی علوم میں دلچسپی لینے پر علامہ کی یہ پیشین گوئی کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

دراصل علامہ اقبال عورت کی تعلیم کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر ایسی تعلیم جو دین پر مبنی ہو۔ صرف دنیاوی اور مغربی تعلیم علامہ کے نزدیک موت کے مترادف ہے' ان کی رائے میں وہ تمام مضامین جو عورتوں کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کے دائرے سے انہیں باہر نکالنے والے ہوں' عورتوں کے نصابِ تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں:

''ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک لڑکیوں کے لئے کوئی خاص نصابِ تعلیم معین و مرتب نہیں کیا' بلکہ ان میں سے بعض بزرگواروں کی آنکھیں تو مغربی تصورات کی روشنی سے ایسی چندھیا گئی ہیں کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کا ایک محل خارجی مواد یعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے' کوئی فرق نہیں سمجھ سکے''۔

اپنی نظم ''عورت اور تعلیم'' میں انہوں نے مغربی تہذیب پر اس طرح تنقید کی ہے:

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت!

علامہ اقبال یورپ کے مخلوط طرزِ تعلیم کے بھی سخت مخالف تھے۔ کیونکہ ان کی نظر میں جو قیود اسلامی معاشرے میں اخلاقی قدروں کو مستحکم کرنے کے لئے مسلمان خواتین پر عائد کی گئی ہیں' مخلوط تعلیم ان قیود و ضوابط کو توڑ دیتی ہے' جس کا نتیجہ اخلاقی زوال ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان خواتین جو مسلم قوم کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں' ان کا الگ نصابِ تعلیم' الگ تعلیمی ادارے اور الگ یونیورسٹی ہو' تاکہ وہ مخصوص نسوانی ماحول میں تعلیم حاصل کریں' کیونکہ مغربی نظریۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی وجہ سے وہ بلا سوچے سمجھے مغربی تہذیب و تمدن کی نقالی کئے جا رہی ہیں۔ چنانچہ آزادیٔ نسواں کے بارے میں وہ فیصلہ عورت ہی پر چھوڑتے ہیں کہ وہ خود سوچے کہ اس کے لئے کیا بہتر ہے۔ اپنی نظم ''آزادیٔ نسواں'' میں فرماتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں' معذور ہیں مَردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟

اقبال کا عورت کے بارے میں نظریہ خالصتاً اسلامی ہے۔ وہ عورتوں کی صحیح تعلیم

اوران کی حقیقی آزادی اور ترقی کے خواہاں ہیں' لیکن آزادیٔ نسواں کے مغربی تصور کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے دخترانِ ملت کے لئے مذہب کو صراطِ مستقیم قرار دیا ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں وہ حاکم پنجاب عبدالصمد کی دختر شرف النساء کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کرتے ہیں جو عشق الٰہی میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ ہر وقت کلام پاک کی تلاوت کرتی رہتی تھی' یہاں تک کہ جب وہ قریب الموت ہوئی تو کہنے لگی: ''اگر تم میرے راز سے باخبر ہو تو دیکھو کہ یہ تلوار ہے اور یہ قرآن۔ یہی دو طاقتیں ہیں جنہوں نے کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے''۔ اقبال اس کے کردار سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:

قلزمِ ما این چنین گوہر نزاد
ہیچ مادر این چنین دختر نزاد
خاکِ لاہور از مزارش آسمان
کس نداند رازِ او را در جہان!

[ہمارے سمندر نے اس جیسا کوئی دوسرا گوہر پیدا نہیں کیا۔ کسی ماں نے اس جیسی بیٹی پیدا نہیں کی۔ لاہور کی خاک اس کے مزار سے آسمان کے ہم مرتبہ ہے۔ اس کے راز کو دنیا میں کوئی نہیں جانتا۔]

علامہ اقبال نے جنگ طرابلس میں ایک عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ کو' جو میدانِ جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی تھی' خراج تحسین پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

فاطمہ تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے!

اور خود عورت کی عظمت کا اعتراف نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' لکھ کر کیا ہے۔ اس پوری نظم سے ماں کے بارے میں ان کے احساسات و جذبات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ لیکن وہ تاریخی ہستی جس کی شخصیت اور ذات سے علامہ کو از حد عقیدت تھی وہ بنت رسولؐ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی مبارک ذات تھی۔ اقبال ان کے کردار

سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ ان کو کہنا پڑتا ہے کہ ''اگر شریعت کی زنجیر پاؤں میں نہ ہوتی تو میں اس عظیم خاتون کی قبر کے گرد طواف کرتا''۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کے بنیادی اوصاف' فقر' قوت' حرمت اور سادگی سے عبارت ہیں اور یہ تمام حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی زندگی میں بدرجۂ اتم جمع ہو گئے تھے۔ انہی اوصاف نے ان کے اُسوہ کو عورتوں کے لئے رہتی دنیا تک مثالی بنا دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مریم از یک نسبتِ عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز
نورِ چشمِ رحمۃ للعالمینؐ
آن امامِ اوّلین و آخرین
بانوئے آن تاجدارِ ھَلْ اَتٰی
مرتضیٰ ' مشکل کشا ' شیر خدا
مادرِ آن مرکز پرگارِ عشق
مادرِ آن کاروان سالارِ عشق

یعنی حضرت مریم کی عزت و تکریم ہم اس لئے کرتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تھیں' لیکن حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی عزت و توقیر تین حیثیتوں سے ہے' کہ وہ حضرت محمد (ﷺ) کی صاحبزادی تھیں' حضرت علیؓ شیر خدا کی زوجہ اور حضرت امام حسینؓ جیسے سالارِ عشق کی والدہ تھیں' اور ان تینوں حیثیتوں میں سیرت و کردار کے جو اعلیٰ نمونے آپؓ نے چھوڑے ہیں وہ مسلمان خواتین کے لئے قابل تقلید ہیں۔

علامہ اقبال عورتوں کے لئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کردار کو مثالی قرار دیتے ہیں اور ان کی خواہش تھی کہ مسلمان خواتین بنت رسولؐ کے طرزِ زندگی کو اپنائیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہوشیار از دستبردِ روزگار
گیر فرزندانِ خود را در کنار

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اُسوۂ زہراؓ مبند
تا حسینے شاخِ تو بار آورد
موسم پیشین بہ گلزار آورد

یعنی اے مسلمان عورت! تو ہوشیار رہ! اور اس زمانے کی دست برد سے اپنے بچوں کو بچانے کی کوشش کر۔ اے عورت! تیری فطرت اپنے اندر بہت بلند جذبات رکھتی ہے' اس لئے تو فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اپنی زندگی کا نمونہ بنا' تا کہ تیری شاخ سے حسین رضی اللہ عنہ جیسے فخر زمانہ شگوفے پھوٹیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مسلمان خواتین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کردار کو مشعل راہ بنالیں تو مسلمان قوم پھر سے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتی ہے' کیونکہ عورت کی جو کچھ عظمت کلامِ اقبال میں ہے' وہ امومت سے وابستہ ہے۔ اقبال کی نظر میں مائیں قوموں کو بناتی اور بگاڑتی ہیں۔ اقبال کی رائے میں عورت کا احترام اصل دین ہے اور اس کی بزرگی و شرف انسانی نسل کی بقا کا ضامن ہے۔ وہ صرف اپنے مادرانہ رتبے میں ہی ارفع و اعلیٰ نہیں بلکہ جمالی اور حیاتی پہلو سے بھی اس کا وجود کائنات کے لئے رنگ و بو کا باعث ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال اپنی نظم ''عورت'' میں اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مُشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!

☆☆☆

(بشکریہ: مجلّہ پیغام آشنا)

سائنس کارنر

مذہب اور سائنس کی کشمکش کا بنیادی موضوع

استمرارِ انواع

(PERPETUATION OF SPECIES)

تحقیق وتحریر: ساجد محمود مسلم

ہر دَور کے فلاسفہ ومفکرین حیاتِ حیوانی کے ارتقاء (evolution) کے کسی نہ کسی شکل میں قائل رہے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی (المتوفی ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کے نزدیک حیات کا آغاز جمادات سے ہوا' اور پھر یہ نباتات اور حیوانات میں ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی انسانی صورت میں مجسم ہوئی۔ مولانا روم کے نظریہ کے مطابق انسان اس سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ کمال نہیں ہے' بلکہ حیاتِ انسانی ارتقائی مراحل طے کر کے حیاتِ ملکوتی کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا روم کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

از جمادی مُردم و نامی شدم
وز نما مُردم بہ حیوان سرزدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم کی زمردن کم شدم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر
تا برآرم از ملایک بال و پر
از فلک ہم بایدیم پراں شوم
آنچہ اندر وہم باید آن شوم

انیسویں صدی میں ڈارون نے بھی ایک نظریۂ ارتقاء پیش کیا جسے سائنسی علوم کے ماہرین میں قبولِ عام حاصل ہوا۔ البتہ اس نظریہ کے ردّ میں بھی بہت سے عقلی دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں فاضل مضمون نگار نے اس طرح کے دلائل کو جمع کیا ہے۔ اس علمی موضوع پر اگر کوئی اور صاحب بھی قلم اٹھانا چاہیں تو حکمت قرآن کے صفحات حاضر ہیں۔ (ادارۂ تحریر)

نوع (species) علم الحیات کی ایک نہایت اہم اور بنیادی اصطلاح ہے۔ سادہ ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو نوع جانداروں کا ایک ایسا گروہ ہے جن کے باہمی جنسی ملاپ سے ایسی زرخیز (fertile) اولاد پیدا ہوتی ہے جو کہ اپنے جیسے جاندار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نوع جانداروں کا ایسا گروہ ہوتا ہے جس کی ابتداء ایک ہی صنفی جوڑے سے ہوئی ہو' اس صنفی جوڑے کو ہم اوّلین جوڑا (Prime Couple) کا نام دے سکتے ہیں۔

معمولی نوعیت کے اختلافات (variations) سے قطع نظر کسی بھی نوع کا ہر فرد اس نوع کے اوّلین جوڑے جیسے خدوخال کا حامل ہوتا ہے۔ نتیجتاً ایک نوع کے سب افراد آپس میں مشابہت رکھتے ہیں اور دوسری نوع کے افراد سے واضح طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ انسان کی مثال لیجئے' اس وقت کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان ایک ہی نوع (Homo Sapiens) سے تعلق رکھتے ہیں۔ جغرافیائی اختلافات کی بنا پر اِن کی مختلف نسلیں (races) بن چکی ہیں' جن کے رنگ و روپ' قد و کاٹھ اور جسمانی نقوش (features) میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے' مگر یہ سب نسلیں ایک ہی نوع شمار ہوتی ہیں۔ نوعِ انسانی دنیا کی باقی تمام انواع سے واضح طور پر مختلف ہے۔ اگرچہ جانداروں کی مشترکہ خصوصیات کے اعتبار سے یہ دوسری انواع سے زیادہ مختلف نہیں' مگر اپنی امتیازی خصوصیات (characteristics) کے اعتبار سے انسان اور دوسری انواع میں واضح فرق نظر آتے ہیں۔ مثلاً دو ٹانگوں پر سیدھا چلنے کی صلاحیت' قوتِ گویائی یعنی الفاظ بنانے کی صلاحیت اور اعلیٰ درجے کی ذہانت دنیا کی کسی دوسری نوع میں نہیں پائی جاتی۔ جسمانی ساخت کے لحاظ سے نوعِ انسانی سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والے جانور بَن مانس (chimpanzee) ہیں' مگر اس حد درجہ مشابہت کے باوجود اُن میں باہم اتنے نمایاں فرق ہیں کہ ایک کم سن و کم فہم بچہ بھی ان میں بآسانی فرق بتا سکتا ہے اور ان کو الگ الگ شناخت کر سکتا ہے۔

نوع کی مذکورہ بالا تعریف کی رو سے نوعِ انسانی کا اوّلین جوڑا بَن مانس کے

اوّلین جوڑے سے یکسر مختلف رہا ہوگا' اور یہی اختلافات نسل در نسل منتقل ہوتے آ رہے ہیں۔ بعینہٖ ہر نوع اپنے اوّلین جوڑے کے خواص نسل در نسل ورثے میں منتقل کرتی چلی آئی ہے۔ ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نوع کے خواص وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنے تبدیل ہو جائیں کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے اوّلین جوڑے کے خواص کو ترک کر دے اور اس سے مختلف خواص کی حامل نوع بن جائے' یوں ایک نئی نوع وجود میں آ جائے۔ بھلا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ چوہوں کا اوّلین جوڑا اپنے جو خواص چوہوں میں منتقل کرے وہ طویل مدت کے بعد اس قدر بدل جائیں کہ چوہا' چوہا نہ رہے بلکہ ہاتھی بن جائے! خواہ کتنا ہی طویل وقت کیوں نہ فرض کر لیا جائے' فطرت کا مسلمہ اصول کہ ''والدین اپنے جیسے خواص اولاد میں منتقل کرتے ہیں'' جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پھر کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ یک خلوی بیکٹیریا محض چار ارب سال سے بھی کم عرصہ میں اس قدر ڈرامائی تبدیلیوں سے گزرے کہ وہ ترقی کرتے کرتے بے مثل نوعِ انسانی کی شکل اختیار کر لے۔ یہ مفروضہ قدرت کے مسلمہ قواعد و قوانین کی یکسر نفی کرتا ہے۔ اگر فطرت کے طے شدہ قوانین نہیں بدلتے تو پھر چار ارب سال ہی نہیں' لامحدود وقت ہی کیوں نہ فرض کر لیا جائے تب بھی کوئی بیکٹیریا ترقی کر کے انسان نہیں بن سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر نوع الگ حیثیت سے تخلیق کی گئی ہے اور ہر نوع اپنے آغاز سے اب تک بعض ظاہری تبدیلیوں (morphological changes) کے سوا' اپنے اوّلین جوڑے کے خواص (characteristics) کو نسل در نسل برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کسی بھی نوع کے اس مستقل تسلسل (continuity) کو استمرارِ نوع (Perpetuation of Species) کہتے ہیں۔ یہ محض کوئی مفروضہ' یا دیومالا (myth) یا افسانہ (fiction) نہیں ہے' بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی بھرپور تائید و تصدیق جدید سائنسی تحقیقات سے بغیر کسی تکلف و تردّد کے ہوتی ہے۔ جینیات یا علم التوارث (Genetics)' جینیٹک انجینئرنگ (Genetic Engineering)' علم الجنین (Embryology)' سالماتی حیاتیات

(Molecular Biology)، رکازیات (Paleontology)، بشریات (Anthropology) اور ارضیات (Geology) جیسے متعلقہ شعبہ ہائے علوم میں ہونے والی عصری تحقیقات اس کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔

ڈی۔این۔اے کی شہادت

علم الحیاتیات کی عصری تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ والدین کی خصوصیات کو اولاد میں منتقل کرنے کا ذمہ دار ایک پیچیدہ مرکب ڈی آکسی رائبو نیوکلیک ایسڈ (Deoxyribonucleic Acid) ہے جسے مختصراً DNA کہتے ہیں۔ یہ ڈی این اے ہر جاندار کے خلئے میں دھاگہ نما ساختوں کی شکل میں موجود ہوتا ہے جنہیں کروموسومز کہتے ہیں۔ درحقیقت کروموسومز دو قسم کے مرکبات یعنی DNA اور پروٹین کے بنے ہوتے ہیں۔ ایک لحاظ سے کروموسومز بنانے کے لئے DNA اینٹوں کا اور پروٹین گارے یا سیمنٹ کا کام دیتی ہے۔

تمام جانداروں کے DNA کی بنیادی ساخت ایک جیسی ہے۔ فرق صرف DNA کو بنانے والی اکائی یا اینٹوں کی ترتیب اور تعداد میں ہے۔ DNA بنانے والی ان اکائیوں کو نیوکلیوٹائیڈز (nucleotides) کہتے ہیں۔ DNA کے ایک مالیکیول میں کروڑوں نیوکلیوٹائیڈز جوڑوں کی شکل میں باہم جڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح DNA کے مالیکیول کی شکل بل دار (helical) زپ جیسی ہوتی ہے۔

حالیہ تجربات وتحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر نوع میں DNA کی مقدار مخصوص (specific) اور مستقل (constant) ہوتی ہے۔ اور ایک نوع کے DNA کی مقدار دوسری انواع کی نسبت مختلف ہوتی ہے، جبکہ ایک ہی نوع کے تمام افراد میں یہ مقدار تقریباً سو فیصد یکساں ہوتی ہے۔ کولچی سین ٹیسٹ (colchicine test) کے ذریعے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ DNA کی مقدار نسلاً بعد نسلٍ مستقل رہتی ہے اور اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

فطرت نے والدین کی خصوصیات کے توارث (inheritance) کے لئے

حکیمانہ طریق کار وضع کیا ہے۔ اسے می اوسس (Meiosis) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ماں باپ کے جنسی خلئے (Germ Cells) یا گیمیٹس (Gametes) اسی می اوسس کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ DNA خلئے کے اندر کروموسومز کے جوڑوں کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ والدین کے نطفے (sperms) اور بیضے (ovum) میں بھی DNA اسی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ نطفے میں باپ کی خصوصیات اور بیضے میں ماں کی تمام خصوصیات ہر ایک کے DNA کے نیوکلیوٹائیڈز کی خاص ترتیب کی صورت میں خفیہ طور پر لکھی ہوتی ہے۔ والدین کے ان جنسی خلیوں اور باقی تمام جسمانی خلیوں میں صرف ایک نمایاں فرق ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ جنسی خلیوں میں کروموسومز کی تعداد جسمانی خلیوں (somatic cells) کی نسبت آدھی ہوتی ہے۔ دراصل جسمانی خلیوں میں کروموسومز ہومولوگس (homologus) جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں جبکہ جنسی خلیوں میں ہر جوڑے میں سے صرف ایک کروموسوم ہوتا ہے۔

ہر نوع میں کروموسومز کے جوڑوں کی تعداد مخصوص ہوتی ہے جسے اس نوع کا ڈپلائیڈ نمبر (Diploid Number) کہتے ہیں' مثلاً انسان میں ۲۳ جوڑے یا کل ۴۶ کروموسومز ہوتے ہیں' پس انسان کا ڈپلائیڈ نمبر ۴۶ ہے' جبکہ جنسی خلیوں میں ہر کروموسوم اکہرا ہوتا ہے' اس لئے اس کی تعداد کو ہیپلائیڈ نمبر (Haploid Number) کہتے ہیں' لہٰذا انسان کے جنسی خلیوں یعنی بیضے اور نطفے میں کروموسومز کی تعداد ۲۳' ۲۳ ہوتی ہے۔ ہر نوع اپنے کروموسومز کے خواص کی بنا پر الگ الگ شناخت کی جاسکتی ہے۔ کروموسومز کے ان امتیازی خواص کو مجموعی طور پر کیریوٹائپ (karyo type) کہتے ہیں۔ ہر نوع کی کیریوٹائپ ہر دوسری نوع سے مختلف ہوتی ہے' لہٰذا ہر نوع کو اُس کی کیریوٹائپ سے الگ شناخت کیا جاسکتا ہے' حتیٰ کہ اگر دو الگ الگ انواع کا ڈپلائیڈ نمبر ایک جیسا بھی ہو تو ان کا کیریوٹائپ باہم مختلف ہوتا ہے۔

می اوسس کے نتیجے میں بننے والے نطفے اور بیضے میں کروموسومز کی تعداد نصف

ہونے میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ جب نطفہ اور بیضہ اختلاط کرنے سے بارآور بیضہ (fertilized egg) یا نطفۂ امشاج (zygote) بنتا ہے تو نئے انسان کا ڈپلائیڈ نمبر مستقل رکھنے کے لئے ماں اور باپ کے ۲۳،۲۳ کروموسومز مل کر ایک بار پھر ۴۶ کروموسومز بن جاتے ہیں جو انسان کا ڈپلائیڈ نمبر ہے۔ یوں یہ نطفۂ امشاج مختلف مراحل سے گزر کر اپنے والدین جیسا انسان بن جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ جانوروں اور پودوں میں ہوتا ہے۔ گویا کہ می اوسس وہ حکیمانہ طریق کار ہے جس کے ذریعے ہر نوع میں کروموسومز کی تعداد یا DNA کی مقدار نسل در نسل مستقل رہتی ہے اور تعداد و مقدار میں کوئی فرق رونما نہیں ہوتا۔ یہ فطرت کا طے شدہ اور اٹل قاعدہ ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ لہٰذا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر نوع اپنے اوّلین جوڑے کے DNA یا ڈپلائیڈ نمبر یا کیریوٹائپ کو نسل در نسل جوں کا توں منتقل کرتی چلی آ رہی ہے اور اسی DNA سے ہی ہر نوع کے تمام خواص تشکیل پاتے ہیں۔ جب ان خواص کو تشکیل دینے والا مادہ نسل در نسل وہی رہتا ہے تو پھر ان خواص میں ایسی تبدیلیاں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں جو نوع کو یا نوع کے بعض افراد کو نسل در نسل تبدیل کر کے اوّلین جوڑے سے یکسر مختلف شے بنا دیں۔ پس DNA کی مقدار کی یہ مستقل مقدار نظریۂ استمرارِ انواع کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

قدیم ترین انواع کی شہادت

اب تک دریافت ہونے والے جانداروں میں سے سب سے قدیم انواع تھرموفائل بیکٹیریا (Thermophile Bacteria) کی ہیں جو آج بھی امریکہ کے یلوسٹون نیشنل پارک میں موجود اُبلتے چشموں (gysers) میں انسانی جسم کو جلا دینے والے درجہ حرارت پر اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان اُبلتے چشموں یا گیزرز کا درجہ حرارت عموماً ۱۹۰ درجہ فارن ہائٹ ہوتا ہے۔ ماہرین کے مطابق تھرموفائل بیکٹیریا دو ارب سال سے زائد مدت سے زمین پر آباد ہیں۔ (۱)

(۱) بحوالہ National Geographic, Vol.193, No.3, March 1998.P.54-81

تھرموفائل بیکٹیریا کا تعلق کنگڈم مونرا (Kingdom Monera) سے ہے۔ جانداروں کا یہ گروہ قدیم ترین گروہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر کنگڈم پروٹسٹا (Protista) کو جانداروں کا قدیم ترین گروہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس گروہ کے افراد کی تعداد جانداروں کے باقی تمام بڑے گروہوں میں سے ہر گروہ کے افراد سے زیادہ ہے۔ کنگڈم پروٹسٹا کے صرف ایک ذیلی گروہ فائیلم پروٹوزوا (Phylum Protozoa) کی چار ہزار کے لگ بھگ انواع زمین پر اپنا وجود دو ارب سال سے آج تک برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

کیا ان قدیم ترین کثیر انواع کا وجود نشاندہی نہیں کر رہا کہ انواع اپنے DNA کو بغیر کسی بڑی تبدیلی کے نسل در نسل منتقل کرنے کے قانونِ فطرت کی پابند ہیں؟ اگر DNA میں قابلِ ذکر تبدیلی رونما ہوئی ہوتی تو یہ قدیم انواع آج جوں کی توں موجود نہ ہوتیں' بلکہ ڈارون ازم کے مفروضے کے مطابق تو انہیں عظیم الجثہ حیرت انگیز جانوروں میں تبدیل ہو جانا چاہئے تھا۔ ان انواع میں ہر نوع کا اپنے خواص برقرار رکھنا واضح کرتا ہے کہ علم التوارث کے اصول وقواعد صحیح ہیں اور ان قواعد کے تحت ہر نوع اپنا وجود مستقلاً قائم رکھ سکتی ہے۔

پس یہ قدیم ترین انواع' استمرارِ انواع کی قوی شہادت ہیں اور اس کے برعکس لیمارک ازم اور ڈارون ازم کے قائلین کا منہ چڑا رہی ہیں۔ کوئی بھی صاحبِ عقل وشعور ان قدیم انواع کے وجود پر غور کرے گا تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ایک نوع سے مختلف خواص کی حامل انواع وجود میں نہیں آ سکتیں بلکہ ہر نوع الگ تخلیق کی گئی ہے اور ہر نوع اپنے اوّلین جوڑے کے خواص کو مستقلاً نسل در نسل منتقل کرتی چلی آ رہی ہے۔

انسانی جینوم کی شہادت

جاندار کی ہر خاصیت (characteristic) کو ایک الگ عامل کنٹرول کرتا ہے جسے جین (gene) کہتے ہیں۔ یہ جینز کروموسومز پر جوڑوں کی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ ہر جین دراصل DNA کے نیوکلیوٹائیڈز کی خاص ترتیب سے وجود میں آتا ہے۔

کسی نوع کے تمام جینز (genes) کے مجموعے کو اس نوع کا جینوم (genome) کہتے ہیں۔ کسی بھی نوع کا جینوم اس کے تمام خواص کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام پر انسانی جینوم کی نقشہ کشی اور DNA کی کتاب پڑھنے کا معرکہ سر کر لیا گیا ہے۔ انٹرنیشنل ہیومن جینوم پراجیکٹ (International Human Genome Project) اور سیلرا جینومکس (Celera Genomics) نامی تحقیقاتی منصوبوں نے انسان کی حیاتیاتی تقدیر آشکار کر دی ہے۔ ان تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً تمام انسانوں کا DNA اپنے خواص کے اعتبار سے قریباً ۹۸ فیصد سے زائد مشابہ و مماثل ہے۔ فرق صرف دو فیصد سے کم ہے۔ اس معمولی فرق کی بنا پر انسانی نسلوں (races) میں تفاوت نظر آتا ہے۔ انسان میں اب تک ۳۸,۰۰۰ جین دریافت ہو چکے ہیں' جبکہ ماہرین کی رائے میں انسانی جینز کی کل تعداد ۵۰,۰۰۰ سے زائد ہے۔ تمام انسانوں کے DNA میں اس قدر مماثلت اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ تمام انسان ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں۔ اوّلین انسانی جوڑے کے زمین پر ظہور سے اب تک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود جینوم میں صرف دو فیصد سے بھی کم فرق رونما ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ طویل عرصہ گزرنے پر بھی DNA کے نیوکلیوٹائیڈز یا جینز میں کوئی ایسی غیر معمولی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جو کسی نئی نوع کے آغاز کا جواز بن سکے۔ اس کے برعکس مدتیں گزرنے کے باوجود DNA نہ صرف مقدار میں مستقل رہتا ہے بلکہ اس کا مجموعی جینوم بھی تقریباً مستقل رہتا ہے' لہٰذا انسانی جینوم پر حالیہ تحقیقات بھی نظریہ استمرارِ انواع کی مکمل تائید و تصدیق کرتی ہیں۔

انسانی جینوم میں ۲ فیصد سے کم فرق کیسے رونما ہوا؟ درحقیقت یہ فرق صرف ایک نہایت حکیمانہ توازن کی غمازی کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر ہر انسان الگ الگ شناخت کیا جا سکتا ہے۔ ہر انسان کے انگوٹھے کے نشان کا مختلف ہونا مذکورہ فرق کا معمولی مظہر ہے۔ اگر یہ فرق نہ ہوتا تو کلوننگ کے نتیجے میں بننے والے جانوروں کی طرح ہر انسان ایک دوسرے کی مثل (exact copy) ہوتا جس سے

لازمی طور پر انسان بے شمار اخلاقی وتمدنی مسائل کا شکار ہو جاتا۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ جانداروں کی تمام خصوصیات کو جینز کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ جینز متضاد جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ان جوڑوں کو اَلیل کہتے ہیں۔ ہر اَلیل میں ایک ہی خصلت (trait) کو قابو کرنے والے ایسے جینز ہوتے ہیں جو اس خصلت کی مختلف صورتوں یا خاصیتوں (characteristics) کو قابو کرتے ہیں۔ فطری طور پر ان میں ایک جین غالب (dominant) ہوتا ہے جبکہ دوسرا مغلوب (recessive)۔ کسی خاصیت کا آبادی میں کثرت سے پایا جانا غالب جین کی وجہ سے ہوتا ہے اور نادر خاصیتیں مغلوب جین کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اگر کسی غالب جین کا حامل نطفہ غالب جین والے بیضے کو بارآور کرے یا مغلوب جین والے بیضے کو تو پیدا ہونے والے بچے میں غالب جین والی خصوصیات ہوں گی اور اگر مغلوب جین والا نطفہ مغلوب جین والے بیضے کو بارآور کرے تو بچہ مغلوب جین والی خاصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اب اس کا تعین فطرت کرتی ہے کہ کس خاصیت کو غالب رکھنا ہے اور کس کو مغلوب۔

جہاں تک جینوم میں ۲ فیصد سے بھی کم فرق کا تعلق ہے تو یہ فرق می اوسس کے دوران کروموسومز پر جین کی ترتیب بدلنے سے رونما ہوتا ہے۔ می اوسس کے نتیجے میں جینز کی ترتیب بدلنے سے نئے اَلیل بنتے ہیں۔ اس عمل کو جینی تغیر (gene mutation) کہتے ہیں۔ جینی تغیرات بہت ہی کم تعداد میں رونما ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی جینی تغیر کسی مفید خاصیت کے پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ کسی جین میں تغیر کا امکان ایک لاکھ میں سے ایک کا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک نسل میں ہونے والے دس ہزار تغیرات میں سے صرف ایک تغیر مفید جبکہ نوے ہزار نو سو ناوے تغیرات مہلک (lethal) ہوتے ہیں۔ بہرحال انسانی جینوم میں ۲ فیصد سے کم تفاوت طویل عرصہ سے ہونے والے مفید تغیرات کے باعث ہے کیونکہ مضر و مہلک تغیرات عموماً اگلی نسلوں میں منتقل نہیں ہوتے۔

عموماً جینی تغیرات کو ''ارتقاء'' (ڈارون ازم) کے لئے خام مال تصور کیا جاتا ہے

اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ جینی تغیرات زیادہ سے زیادہ جس شکلی اثر (phenotypical effect) کا سبب بن سکتے ہیں وہ انسانی نسلوں میں موجود اختلافات (variations) سے بڑھ کر مزید کوئی انوکھی اور غیر فطری خاصیت پیدا کر کے اسے نسل در نسل منتقل نہیں کر سکتے۔ درحقیقت جتنے اختلافات کسی نوع میں افراد کے مابین نظر آتے ہیں وہ سب جینز کے مرہونِ منت ہیں۔ کسی نوع میں جو زیادہ سے زیادہ خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں وہ کسی بھی فرد کے DNA میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ فطرت کبھی کسی خاصیت کو ظاہر کر دیتی ہے اور کبھی کسی خاصیت کو۔ کسی بھی نوع میں ایک بھی ایسی خاصیت پیدا نہیں ہوتی جو اس نوع میں باہر سے آئی ہو۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر کسی بھی نوع کا نہ صرف DNA مستقل رہتا ہے بلکہ اس سے پیدا ہونے والے خواص بھی اس نوع میں مستقلاً موجود رہتے ہیں۔ نہ تو اس نوع کی کوئی خاصیت مطلقاً ختم ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری نوع کی یا اپنی نوع سے یکسر مختلف کوئی نئی خاصیت حاصل کر سکتی ہے۔ لہٰذا ایک نوع سے کسی دوسری نوع یا انواع کے ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو اس نوع کے مجموعی خواص رجینوم سے مختلف خواص رجینوم کی حامل ہو۔ اور اگر بالفرض ایسا ممکن ہے تو کیا نوعِ انسانی سے کسی دوسری نوع یا انواع کے ظہور کا امکان ہے؟ اگر ہے تو کتنے فیصد؟ نیز اس نوع کے خدوخال اور انسان سے مختلف امتیازی خصوصیات کے سلسلے میں کیا پیشین گوئی کی جا سکتی ہے؟

سابقہ سطور میں مذکورہ حقائق کے پیشِ نظر ہمارے نزدیک تو انسان سے کسی نوع یا انواع کے ظہور کا امکان صفر سے بھی کم ہے۔ بعینہٖ نہ تو انسان کسی دوسری نوع کی ترقی یافتہ شکل ہے اور نہ دوسری انواع اپنے سے مختلف انواع سے ارتقاء پذیر ہوئی ہیں' بلکہ ہر نوع آزادانہ حیثیت میں پیدا ہوئی ہے اور اپنی بقا کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔ البتہ جینی تغیرات سے ارتقائے اصغر (Micro Evolution) کا وقوع ممکن ہے۔ ہمارے نزدیک ارتقائے اصغر سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی نوع میں طویل عرصہ تک جینی تغیرات کے وقوع سے یا کروموسومز میں بعض مفید تغیرات کے وقوع سے

یکبارگی (spontaneously) اسی نوع کی فروع یعنی varieties یا forms بن سکتی ہیں۔ کسی بھی نوع کی جتنی فروع نظر آتی ہیں وہ اسی ارتقائے اصغر کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں، مگر ارتقائے اصغر سے نئی انواع وجود پذیر نہیں ہوسکتیں، یہ فطرت کا طے شدہ اصول ہے۔ فروع کی تشکیل فطری طور پر بھی ہوتی ہے اور مصنوعی طور پر بھی نئی فروع پیدا کی جاسکتی ہیں، مگر یہ فروع اپنے ہیپلائیڈ نمبر اور کیریوٹائپ میں یکساں ہوتی ہیں، ان میں فرق صرف جینی ترتیب genetic sequence یا کروموسومز کے ہیپلائیڈ سیٹوں کی تعداد میں ہوتا ہے، جس کا مزید تذکرہ آگے چل کر آ رہا ہے۔

اِستمرارِ انواع اور تشکیل فروع

کسی بھی نوع میں فروع کی تشکیل کا رجحان (tendency) اس نوع کی بقاء و استمرار کا ضامن ہے۔ جب کسی نوع کی آبادی (population) کافی بڑھ جائے اور دنیا کے وسیع رقبوں پر پھیل جائے تو اس میں فروع کی تشکیل کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ زمین پر ماحول بہت متنوع (diverse) ہے، میدان، صحرا، کوہستان اور برف زار کی آب و ہوا میں نمایاں طور پر فرق موجود ہوتا ہے، مختلف قسم کے ماحول کے تقاضے (requirements) مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ جب کسی نوع کی آبادی پھیل کر اپنے وطن اصلی (native) سے باہر نکلتی ہے تو ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے بعض نئی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ایسے تمام جینی تغیرات جو نوع کے افراد میں ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں معاون ہوں، فطرت انہیں منتخب کر لیتی ہے اور ایسے تغیرات جو ماحول سے عدم مطابقت کا باعث بنیں رفتہ رفتہ خارج (eliminate) کر دیئے جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس تنازع للبقاء (struggle for survival) میں نوع کے وہ افراد فتح مند ہوتے ہیں جن میں اپنے خواص بہتر انداز میں کامیابی کے ساتھ اگلی نسل میں منتقل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ دوسرے افراد کے مقابلے میں زیادہ پائیدار (viable) ثابت ہوتے ہیں۔

نتیجتاً بقائے اصلح (survival of the fittest) کے اصول کے تحت ایسے

افراد کی تعداد نسلاً بعد نسلٍ بڑھتی ہے جن میں ماحول کو برداشت (tolerate) کرنے کی صلاحیت زیادہ ہو۔ ماحول کو برداشت کرنے کی یہ صلاحیت جینی تغیرات سے پیدا ہوتی ہے۔

بعض اوقات کسی نوع کی آبادی اتنے وسیع رقبہ تک پھیل جاتی ہے کہ ان کے درمیان بعض حد بندیاں (bariers) پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی بڑا پہاڑ' یا چوڑا دریا یا سمندر وغیرہ۔ ان حد بندیوں کی وجہ سے نوع کی آبادی جدا جدا (isolated) اور نسبتاً چھوٹی آبادیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اگر چہ کوئی دو آبادیاں شاذ و نادر ہی مکمل طور پر الگ تھلگ (isolated) ہوتی ہیں تاہم اس علیحدگی کے باعث ان میں کثرت سے اختلاط (frequent courtship) ممکن نہیں رہتا' جس کے نتیجے میں ایک بڑا جینی تالاب چھوٹے چھوٹے جینی تالابوں (gene pools) میں بٹ جاتا ہے۔ اب ہر جینی تالاب میں اپنے خاص ماحول کے مطابق خواص کا انتخاب و ردّ (selection & elimination) ہوتا ہے۔ یوں ایک ہی نوع کی ان جدا جدا آبادیوں میں بعض شکلی اختلافات (morphological differences) رونما ہونے لگتے ہیں۔ جب طویل عرصہ تک یہ عمل جاری رہتا ہے تو یہ آبادیاں ایک جیسا جینوم رکھنے کے باوجود بعض خواص میں ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہیں۔ تب ایک ہی نوع کی مختلف آبادیوں کو اس نوع کی فروع (varieties)' یا نسلیں (races) یا ذیلی انواع (sub-species) قرار دیا جاتا ہے۔

نوع کی فروع تشکیل پانے کا یہ سارا طویل عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس طرح نوع کی بقا کے امکانات پہلے کی نسبت بہت بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ اب اگر کوئی شدید تبدیلی ماحول میں پیدا ہو جائے تو فروع کے خواص میں تنوع (diversity) ہونے کے باعث ایک یا ایک سے زائد فروع اس تبدیلی کو لازماً برداشت کر جائیں گی۔ یوں نوع معدومیت (extinction) کے خطرے سے بچ جائے گی۔

واضح رہے کہ کسی بھی نوع کی فروع میں اگر چہ اختلاط کے مواقع بہت کم ہو جاتے

ہیں مگر یکسر ختم نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ جزائر پر آباد انواع کی آبادیوں کا اختلاط ان کی بری آبادیوں سے ناممکن نہیں۔ لہٰذا جغرافیائی علیحدگی اور جین پول میں اختلافات کے باوجود یہ فروع اپنی اصل نوع سے تعلق توڑ کر نئی انواع نہیں بن سکتیں' کیونکہ الگ انواع کے لئے مکمل جینی تفریق (genetic isolation) ضروری ہے جبکہ یہ فروع جینوم کے اعتبار سے یکساں ہوتی ہیں اور عموماً جغرافیائی اعتبار سے بھی کامل طور پر علیحدہ نہیں ہوتیں۔

مصنوعی انتخاب (artificial selection) کے ذریعے بھی پسندیدہ خواص کی حامل فروع یا نسلیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ آج بھی بہت سے پالتو جانوروں (domestic animals) کی مخلوط (hybrid) نسلیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ مصنوعی انتخاب کا یہ عمل بھی استمرارِ انواع کی تائید کرتا ہے' وہ اس لئے کہ مصنوعی انتخاب سے ایسے جانور اور پودے پیدا کئے جا رہے ہیں جن میں پیداواری صلاحیت اور بیماریوں کے خلاف مدافعت قدرتی فروع سے زیادہ بہتر انداز میں اپنی نوع کے وجود کو قائم رکھ سکتی ہے۔ لہٰذا انواع میں فروع کی تشکیل کا رجحان بھی نظریۂ استمرارِ انواع کو تقویت دیتا ہے۔ فروع کی تشکیل کا مقصد ہی انواع کی بقا و استمرار ہے' کیونکہ فروع کسی بھی نوع کو دوام بخشتے ہوئے اس کے جینوم کو آئندہ نسلوں میں منتقل کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے' جبکہ جینوم کی بقا ہی نوع کی بقا ہے۔

صورت و فعل کا تنوع

اس وقت کرۂ ارض پر بسنے والے جانوروں کی پندرہ لاکھ اور پودوں کی پانچ لاکھ انواع سے انسان واقفیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ انواع اپنی صورت و شکل اور فعل کے اعتبار سے انتہائی متنوع ہیں۔ کسی دو انواع کے مابین صورت و فعل کا تنوع (diversity) نہایت واضح ہوتا ہے۔ یہ تنوع صرف فینوٹائپ کے لحاظ سے ہی نہیں' بلکہ جینوٹائپ کے اعتبار سے تو یہ تنوع اور بھی زیادہ ہے۔ سادہ ترین پروکیریاٹک بیکٹیریم سے لے کر اعلیٰ ترین نوعِ انسانی تک جانداروں کی صورت و فعل میں شدید

اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پھر جب نوع کے درجہ سے بلند درجوں کی طرف بڑھتے ہیں تو یہ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں۔ جینس (Genus)، فیملی (Family)، آرڈر (Order)، کلاس (Class)، فائیلم (phylum) اور کنگڈم (Kingdom) جانداروں کی درجہ بندی (classification) کے زینے کے علی الترتیب اعلیٰ مدارج ہیں۔ اس زینے پر چڑھتے جائیں، ہر درجے پر ٹھہر کر انواع کا باہم موازنہ کر کے دیکھیں تو اوپر چڑھتے ہوئے ہر درجے پر پہلے سے زیادہ تنوع پائیں گے۔ زندگی میں اس قدر رنگا رنگی اور بوقلمونی کس طرف اشارہ کرتی ہے؟ ایک اوسط ذہنی سطح کا آدمی بھی زندگی کے اس تنوع سے یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ان سب جانداروں کا کوئی ایک مشترکہ مورثِ اعلیٰ (Primitive Anscestor) بہرحال نہیں ہوسکتا۔ جینوٹائپ کا اختلاف تو بہت زیادہ اور اہم ہے ہی، فینوٹائپ کا اختلاف بھی کسی حقیقت پسند شخص کو یہ مفروضہ ماننے سے مانع ہے کہ آج کل زندہ موجود تمام انواع اور تمام معدوم انواع ایک ہی فرد (individual) کی آل اولاد (descendants) ہیں۔ ہاں محض افسانوی وطلسماتی داستانوں میں دلچسپی لینے والا شخص اس دلچسپ مفروضے کا شیدائی بن سکتا ہے۔

ڈارون ازم کے خوبصورت و دلچسپ مفروضے کے حامی مختلف انواع کے بے پناہ اختلافات کو نظر انداز کر کے محض مشابہاتی اعضاء (homologus organs) کو ہوّا بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان کے ذریعے اپنے باطل مفروضے کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ analogus organs کی تعداد homologus organs کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ اسی طرح تقابلی اناٹومی (Comparative Anatomy) سے مختلف انواع کے اعضاء کی بناوٹ میں واضح فرق دکھائی دیتے ہیں۔ بھلا ہاتھی اور چوہے کو ایک باپ کی اولاد قرار دینا مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے؟ محض تخیلاتی تک بندیوں کے ذریعے تو شاید ان دونوں کو ایک ہی باپ کی اولاد قرار دیا جاسکتا ہو، مگر ٹھوس سائنسی حقائق کی روشنی پڑتے ہی ایسی

افسانوی کہانیوں کا پول کھل جاتا ہے۔

ہر نوع کے مخصوص جینوم' می اوسس اور اصول بقائے اصلح کی موجودگی میں ایسے افسانوں کی ایک نہیں چل سکتی۔ ہر نوع کے جینوم کی نسل در نسل مستقل منتقلی کے باوجود کیسے ممکن ہے کہ فینوٹائپ میں بھی اس قدر طلسماتی فرق رونما ہو جائیں کہ ایک بیکٹیریم نما جانور کروڑوں سال سے مختلف شکلیاتی تبدیلیوں سے گزر کر کرۂ ارض کا سب سے بڑا ممالیہ آبی جانور وہیل (whale) اور خشکی کا سب سے بڑا جانور ڈائنو سار (dianosaur) بن جائے۔ صرف فلسفہ ہی نہیں بلکہ سائنسی حقائق بھی اس افسانوی مفروضے کی نفی کرتے ہیں۔ یہ افسانہ تو اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جیسے کسی مینڈک کا یک دم کسی شہزادے کا روپ ڈھال لینا۔

یہ معلوم و مسلمہ حقیقت ہے کہ ماحول کے اثرات یا جینی تغیرات سے کسی بھی فرد میں ایسے نئے کارآمد اعضاء (organ) پیدا نہیں ہو سکتے جو آئندہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہیں۔ بعض اوقات جینی تغیرات سے ایسے اضافی یا نئے اعضاء پیدا ہو جاتے ہیں جو فرد کے لئے کارآمد (useful) تو کیا ہوں' الٹا اسے اپاہج (abnormal) بنا دیتے ہیں۔ ایسے اعضاء کلیتًا ناکارہ ہوتے ہیں۔ اس کی معروف مثال پھل مکھی (drosophila) میں ہونے والا تغیر (antennapedia) ہے۔ اس تغیر میں عین اس جگہ پر ٹانگیں پھوٹ پڑتی ہیں جہاں پر اس جاندار کے محاسے (antenna) ہوتے ہیں۔ سر کے اوپر ٹانگوں کا یہ اضافی جوڑا پھل مکھی کے لئے یکسر ناکارہ ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ پھل مکھی محاسے (antenna) نہ ہونے کی وجہ سے اپاہج ہو جاتی ہے' کیونکہ اب وہ ماحول میں آواز کی موجیں (waves) محسوس کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

بھلا ایسے اپاہج بنا دینے والے تغیرات سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ کروڑوں برس کا عرصہ گزرنے کے بعد ایک ہی نوع میں نسل در نسل' نئے سے نئے اعضاء بنتے جائیں اور اس کا جثہ بھی اصل سے لاکھوں گنا بڑا ہوتا جائے۔ زمین پر دو ارب سال سے زندہ انواع کا بغیر کسی ڈرامائی تبدیلی کے اب تک موجود رہنا بھی اس بات کی دلیل

ہے کہ کسی نوع میں بھی ایسے نئے اعضاء پیدا نہیں ہو سکتے جو اُن کے آباء کی نسبت کوئی نیا یا انوکھا فعل سرانجام دے سکیں۔ جب یہ حقیقت ہے تو پھر کیسے یقین کر لیا جائے کہ مچھلیاں غیر فقاریہ جانوروں (invertebrates) سے، جل تھلئے (amphibians) مچھلیوں سے، ہوام (reptiles) جل تھلیوں سے، پھر ہوام سے اڑنے والے پرندے اور انہی ہوام سے دودھ والے جانور یعنی ممالیہ (mammals) بن گئے ہوں گے؟ گلپھڑوں (gills) سے سانس لینے والی مچھلیوں میں پھیپھڑے کہاں سے آ گئے کہ وہ خشکی پر سانس لے سکیں؟ بیرونی اختلاط (external fertilization) والے جل تھلیوں میں رحم (uterus) کیسے پیدا ہو گیا تا کہ وہ اندرونی اختلاط (internal fertilization) کرنے کے قابل بن کر بعض ہوام (reptiles) یا ممالیہ میں تبدیل ہو سکیں؟ اوّلین amniotes یعنی ہوام میں اضافی جنینی جھلیاں extra embryonic membrains) اچانک کیسے پیدا ہونے لگیں تا کہ وہ تولید کے لئے پانی کی قربت ہونے کی شرط سے آزاد ہو سکیں؟ حشرات کے محاسے (antenna) کان جیسی پیچیدہ ساخت میں کیسے تبدیل ہو گئے؟ کلیمیڈ وموناس کا آئی سپاٹ (eye spot) پیچیدہ آنکھ میں کیسے بدل گیا؟ چوہے کا ناک ہاتھی کی سونڈ کی شکل اختیار کرنے میں کیسے کامیاب ہوا؟ لال بیگ (cockroach) کی haemocoelomic channels انسان کے انتہائی مربوط و منظم نظامِ دورانِ خون (blood circulatory system) میں کیسے تبدیل ہوئیں؟ مختصراً یہ کہ سادہ اعضاء سے تمام پیچیدہ اعضاء کیسے بن گئے؟ کیمبرین عصر (Cambrian Period) میں انتہائی متنوع اور پیچیدہ کثیر خلوی جانور اچانک سمندر میں کیسے نمودار ہوئے؟ ان کے اس اچانک ظہور کی کیا معقول توجیہہ کی جا سکتی ہے جبکہ اس دور سے قبل محض سادہ یک خلوی جاندار ہی موجود تھے؟ علم التوارث کے اصول کے برعکس یہ سادہ جاندار اتنی بڑی تعداد میں پیچیدہ جانداروں کی شکل کیسے اختیار کر گئے؟

شاید طلسماتی قیاس آرائیوں سے ان سوالات کے جوابات دیئے جا سکتے ہیں، مگر

علم التوارث اور جنیٹک انجینئرنگ کے مسلمہ اصول و قواعد (proved principles) کو سامنے رکھ کر ایسی قیاس آرائیوں کی رتی بھر بھی اہمیت نہیں رہتی۔ پھل مکھی کی مذکورہ بالا مثال اور ایسے سینکڑوں حقائق ثابت کر چکے ہیں کہ ایک نسل سے دوسری نسل میں کتنے ہی جینی تغیرات کیوں نہ ہوں' نئے مفید اعضاء بہرحال وجود میں نہیں آتے۔ نتیجتاً جینی تغیرات سے وہ اکثر اختلافات پیدا نہیں ہو سکتے جو کہ زندہ انواع کے اعضاء و افعال میں فی الحقیقت دکھائی دیتے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے؟ اس کی صحیح توجیہہ یہی ہے کہ تمام انواع جدا جدا خواص کے ساتھ تخلیق کی گئی ہیں اور علم التوارث کے اصولوں کے تحت یہ خواص نسل در نسل نہایت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ منتقل ہو رہے ہیں۔ تمام جدید حیاتیاتی تحقیقات (Biological Researches) اسی توجیہہ کو عقل کے عین مطابق ثابت کر رہی ہیں۔ رہے دوسرے مفروضات' یعنی لیمارک ازم' ڈارون ازم' تو وہ اوّلاً تو ایسے دور میں منصۂ شہود پر آئے کہ جب انسانی علم توارث کے بارے میں نامکمل اور ناقص تھا' لہٰذا ان مفروضوں میں شدید نقائص کا پایا جانا عین فطری امر ہے' دوم یہ مفروضات ناقص و محدود معلومات کے باعث محض احتمالات (probabilities) کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تحقیقات ان مفروضوں کی سخت تردید کر رہی ہیں۔

باور کر لیں کہ ماضی میں تمام جانداروں کا کوئی واحد مشترک مورثِ اعلیٰ (Primitive Ancestor) موجود نہیں تھا' بلکہ ہر نوع آزادانہ حیثیت میں تخلیق کی گئی ہے۔ اسی طرح انسان اور بوزنے یا بے دُم بندر (apes) کا بھی کوئی مشترک مورث اعلیٰ یا جدّ امجد نہیں تھا' بلکہ انسان اور بوزنے ہمیشہ الگ الگ انواع رہی ہیں۔

لہٰذا اللہ قادر مطلق نے محض اپنی قدرت و حکمت سے ہر نوع کو الگ حیثیت میں اپنی مشیت کے مطابق پیدا فرمایا۔ زمینی ماحول جس جس نوع کے لئے سازگار ہوتا گیا اسی ترتیب سے مشیت الٰہی سے انواع تخلیق ہوتی رہیں' یہاں تک کہ جب زمین انسان

کے رہنے کے قابل بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اوّلین انسانی جوڑے سیدنا ابوالبشر آدم علیہ السلام اور اُمّ البشر حوا سلام علیہا کو متمکن فرمایا اور انہی سے نوعِ انسانی زمین پر پھیلائی۔ Y کروموسوم اور مائٹوکونڈریائی DNA اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہیں' اس لئے کہ Y کروموسوم صرف باپ کی طرف سے ملتا ہے' جس کا مطلب یہ ہوا کہ اوّلین باپ سب انسانوں کا ایک ہی تھا۔ اسی طرح مائٹوکونڈریل DNA صرف ماں کی طرف سے ملتا ہے' جس کا مطلب ہے کہ سب انسانوں کی ایک ہی مشترک ماں تھی۔

واضح رہے کہ DNA کی نسل در نسل یکساں طور پر منتقلی حیاتیات کا عام مسلمہ قاعدہ ہے' البتہ دیگر فطری قوانین کی طرح اس اصولِ حیات میں بھی کچھ جزوی مستثنیات (exceptions) ہیں جن کا مطالعہ ہم Cytogenetics کے تحت کرتے ہیں۔ ان مستثنیات کی حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات گیمیٹس بننے کے عمل یعنی می اوسس کے دوران کروموسومز کی ساخت یا تعداد میں کچھ تغیرات (mutations) واقع ہو جاتے ہیں جنہیں اصطلاحاً کروموسومز کے انحرافات (chromosomal aberrations) کہتے ہیں۔ البتہ کروموسومز کے انحرافات خواہ ساخت میں ہوں یا تعداد میں' انسانوں اور جانوروں کے لئے صرف مضر ہی نہیں بلکہ مہلک ہوتے ہیں۔ پودوں میں بھی صرف ایک قسم کے انحرافات' جس میں کوئی نئی جینی معلومات پیدا نہیں ہوتیں' مفید ہو سکتے ہیں جن کے نتیجے میں نوع کی کوئی فرع یا ذیلی نوع (sub-species) یک بارگی (spontaneously) وجود میں آ جاتی ہے۔ کروموسومز میں انحرافات میں اس ایک استثناء کے سوا کسی بھی قسم کو مفید قرار نہیں دیا جا سکتا' لہٰذا یہ سب انحرافات مل کر بھی کوئی نئی نوع وجود میں نہیں لا سکتے۔ پودوں میں جو ذیلی نوع یا فرع آٹو پولی پلائیڈی (autopoly ploidy) کے ذریعے پیدا ہوتی ہے وہ بھی کسی طویل ارتقاء (evolution) کا نتیجہ نہیں ہوتی' بلکہ یک بارگی پیدا ہو جاتی ہے' لہٰذا DNA کا مستقل مقدار کو قائم رکھنے کا اصول ان مستثنیات سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یوں بھی کروموسومز کے نادر انحرافات کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ کسی

فرد میں DNA کی مقدار میں کمی بیشی ہوسکتی ہے' مگر اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ یا تو مذکورہ فرد پیدا ہوتے ہی مرجائے گا' اور اگر زندہ بھی رہے گا تو اپاہج (abnormal) فرد کی حیثیت سے زندگی گزارے گا' لہٰذا اس معذوری (abnormality) کے باعث وہ اپنی جیسی زرخیز اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہے گا۔ انسان میں ڈاؤنز سنڈروم (Down's Syndrome)' ٹرنرز سنڈروم (Turner's Syndrome) اور کلینی فلیٹر زسنڈروم (Klinefelter's Syndrome) جیسے شدید نقائص کروموسومز کے انحرافات کا ادنیٰ سا مظہر ہیں۔ جانوروں اور پودوں میں تو ایسے انحرافات نہایت مہلک (lethal) ثابت ہوتے ہیں' لہٰذا کروموسومز کے انحرافات سے کسی نوع کے فرد یا چند افراد میں شاذ و نادر رونما ہونے سے بھی اس نوع کا جینوم اور کیریوٹائپ تبدیل نہیں ہوتا' کیونکہ یہ ابنارمل افراد اصولِ بقائے اَصلح کے تحت بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ یوں DNA کی کمی یا زیادتی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے سے قاصر رہتی ہے' جبکہ اس نوع کی باقی صحت مند آبادی پوری کامیابی سے اپنے اوّلین جوڑے کے خواص DNA کی شکل میں اگلی نسل میں منتقل کر دیتی ہے اور سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ پس نظریۂ استمرارِ انواع ہی جدید سائنسی نقطۂ نظر سے قابل قبول کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں لیمارک ازم یا ڈارون ازم ردّ کئے جانے کے قابل ہیں۔

گویا کہ اب خالصتاً علمی سطح پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہر نوع الگ حیثیت میں تخلیق کی گئی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے محض کلمۂ کن کہہ کر کائنات بنائی اور اسی طرح ہر نوع محض کلمۂ کن سے تخلیق فرمائی۔

☆ ☆ ☆

امام لیث بن سعدؒ

تحریر: عبدالرشید عراقی

زمرۂ تبع تابعین میں امام لیث بن سعدؒ اپنے تبحر علمی' تفقہ فی الدین' عدالت و ثقاہت' حفظ وضبط' ذکاوت وفطانت' امانت ودیانت' تقویٰ وطہارت' زہد وورع' تواضع ومہمان نوازی اور سخاوت وفیاضی کے اعتبار سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے۔ ان کے علم وفضل اور تمام علومِ اسلامیہ میں صاحب کمال ہونے کا ان کے معاصرین' اساتذہ اور تلامذہ نے اعتراف کیا ہے۔ حدیث اور فقہ میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ حدیث میں ان کے تبحر علمی کا نامور ائمہ حدیث نے اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ:

''لیث بن سعد کثیر العلم اور صحیح الحدیث تھے۔ اور مصر میں صحیح احادیث کی روایت اور ان کے حفظ واتقان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا''۔

ائمہ محدثین اور تذکرہ نگاروں نے ان کو ثقہ وثابت لکھا ہے۔

امام لیث کو فقہ میں بھی عبورِ کامل تھا اور ضرورت کے مطابق کتاب وسنّت سے اجتہاد کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں عراق میں امام ابوحنیفہؒ اور شام میں امام اوزاعیؒ کے مجتہدات کا چرچا تھا اور حجاز میں امام مالکؒ کے تفقہ واجتہاد کا غلغلہ بلند تھا۔ مصر کی سرزمین میں کوئی ممتاز مجتہد پیدا نہیں ہوا تھا۔ امام لیث بن سعد کے وجود سے یہ کمی پوری ہوگئی۔ ان میں پورا ملکۂ اجتہاد موجود تھا۔ تفقہ واجتہاد میں ان کا جو مرتبہ ومقام تھا اس کے متعلق امام شافعی فرماتے ہیں:

''امام لیث بن سعد امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے' لیکن ان کے تلامذہ نے ان کو ضائع کردیا''۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

''جس طرح امام مالک کے تلامذہ نے فقہ مالک کی تدوین کی' امام لیث بن سعد کے تلامذہ نے ان کی فقہ کی نہیں کی۔''(۱)

دوسرے علوم میں بھی امام لیث کو یدِ طولیٰ حاصل تھا اور تمام علوم میں ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن بکیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''میں نے امام لیث بن سعد سے زیادہ جامع آدمی نہیں دیکھا۔ وہ مجسم فقیہہ تھے۔ ان کی زبان خالص عربی تھی' قرآن نہایت عمدہ پڑھتے تھے' نحو میں بھی درک تھا اور اشعارِ عرب اور حدیث کے حافظ تھے' گفتگو بڑے عمدہ پیرائے میں کرتے تھے۔''(۲)

روزمرہ کے معمولات

امام لیث بن سعد نے اپنی زندگی بڑی مصروف گزاری۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ امام لیث نے دن کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ روزانہ ان کی چار مجلسیں ہوتی تھیں۔ پہلی مجلس حکومت و ارکانِ حکومت کی ضروریات کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ دوسری مجلس میں وہ تشنگانِ حدیث نبویؐ کی پیاس بجھاتے تھے۔ تیسری مجلس ان لوگوں کی ہوتی تھی جو اُن سے مختلف مسائل کے جوابات دریافت کرتے تھے۔ چوتھی مجلس عام لوگوں کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ ان تمام مجالس میں سب کے ساتھ ان کا سلوک و برتاؤ بہت اچھا ہوتا تھا۔ ان میں ایک خاص وصف تھا کہ کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے اور ہر حاجت مند کی حاجت پوری کرتے تھے' خواہ اس کی حاجت چھوٹی ہو یا بڑی۔(۳)

سیرت و کردار

سیرت و کردار کے اعتبار سے امام لیث بن سعد اسلامی زندگی کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان جیسا جامعِ اوصاف تبع تابعین کے گروہ میں مشکل ہی سے ملے گا۔ عبداللہ بن وہب کا قول حافظ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے کہ:

''جو کچھ آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے ان سب کو وہ اپنی زندگی میں برتتے تھے۔''(۴)

حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ:

''امام مالک امام لیث کے جامعِ اوصاف ہونے کے بہت زیادہ معترف تھے اور امام مالک کا ان سے سلسلۂ خط و کتابت تھا۔ امام لیث مالی اعتبار سے بہت زیادہ خوشحال تھے اور مستقل طور پر ایک سو دینار سالانہ امام مالک کو بھیجا کرتے

تھے۔ایک بار امام مالک نے امام لیث بن سعد کو لکھا کہ مجھ پر کچھ قرض ہو گیا ہے تو فوراً پانچ سو دینار بھجوا دیئے۔ایک بار امام مالک نے امام لیث کو لکھا کہ مجھے تھوڑی سی عصفر (زرد رنگ کی گھاس) لڑکوں کے کپڑے رنگنے کے لئے بھجوائی جائے۔امام لیث نے یہ اتنی مقدار میں بھیجی کہ انہوں نے خود بھی استعمال کی' پڑوسیوں کو بھی استعمال کے لئے دی پھر بھی بچ گئی' اور جو بچ گئی اس کو امام مالک نے ایک ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔''(۵)

اس واقعہ کو خطیب بغدادی اور حافظ ابن حجر نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ امام لیث بن سعد میں ایک اور وصف بھی تھا کہ ان سے کوئی آدمی کوئی چیز طلب کرتا تو اس کی طلب سے اُس کو زیادہ دیتے۔مہمان نوازی میں بھی ضرب المثل تھے اور صدقہ و خیرات بھی بہت زیادہ کرتے تھے۔ایوانِ حکومت میں ان کا بہت اثر و رسوخ تھا' لیکن کبھی بھی کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔خلیفہ منصور نے ان کو عہدۂ قضاء کی پیشکش کی لیکن اسے قبول نہ کیا۔حق گوئی ان کا خاص وصف تھا اور اس سلسلہ میں ارکانِ حکومت کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے وہاں ایک فتنہ بزرگوں پر طعن و تشنیع اور سب و شتم کا تھا۔جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرنا ضروری سمجھتے تھے اور جو لوگ حضرت علیؓ کے حامی تھے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نشانۂ تنقید بناتے تھے۔مصر میں حضرت علیؓ کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ تنقیص اور مذمت ہوتی تھی۔ مصر میں جب حضرت لیث بن سعدؒ کا اثر و رسوخ بڑھا تو انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور حضرت عثمانؓ کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کر دیئے' یہاں تک کہ تنقیص عثمانؓ کی بدعتِ سیئہ مصر سے ختم ہو گئی۔'' (۶)

خاندان

امام لیث بن سعدؒ کا آبائی وطن اصفہان تھا' لیکن ان کے آباء و اجداد کسی وجہ سے اصفہان سے آ کر مصر میں آباد ہو گئے تھے۔(۷)

ذاتی حالات

امام لیث کی کنیت ابوالحرث تھی۔ والد کا نام سعد اور دادا کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ خود فرماتے تھے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہوا تو میں اس وقت سات برس کا تھا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا۔

ابتدائی تعلیم مصر میں حاصل کی۔ بعد میں دوسرے مقامات پر جا کر اُس دَور کے معروف اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں کہ:

وخلائق لا یحصون من الائمة (۸)

''اتنے ائمہ سے استفادہ کیا جن کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے''۔

حضرت نافع بن مولیٰ ابن عمرؓ اُن کے اساتذہ میں شامل تھے۔ امام لیث کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ مشہور تلامذہ میں عبداللہ بن مبارک' عبداللہ بن وہب اور آدم بن ایاس شامل ہیں۔

امام لیث بن سعدؒ نے ۱۷۵ھ میں مصر میں انتقال کیا۔ عمر ۸۲ برس تھی اور مصر کے مشہور قبرستان قرافہ صغریٰ میں دفن ہوئے۔ ان کے جنازہ میں ایک جم غفیر شامل تھا اور تمام لوگ غم سے نڈھال نظر آتے تھے۔ خالد بن عبدالسلام صدقی بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد محترم عبدالسلام کے ساتھ جنازہ میں شریک تھا۔ میں نے اپنے والد سے سوال کیا کہ جنازہ میں ہر شخص غم زدہ معلوم ہوتا ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟ میرے والد محترم نے فرمایا کہ بیٹا! یہ ایسے جامع کمالات عالم تھے کہ شاید تمہاری آنکھیں پھر ایسا عالم نہ دیکھیں۔ (۹)

حواشی

۱) الرحمۃ النشیہ' ص ۹
۲) تذکرۃ الحفاظ' ج ۱' ص ۲۰۴
۳) الرحمۃ النشیہ' ص ۹
۴) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۷۔
۵) صفوۃ الصفوۃ' ج ۴' ص ۲۸۲
۶) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۷
۷) الرحمۃ النشیہ' ص ۳
۸) تہذیب الاسماء' ج ۱' ص ۴۷
۹) الرحمۃ النشیہ' ص ۹

سالانہ رپورٹ شعبہ خط و کتابت کورسز

(۲۰۰۳ء۔۲۰۰۲ء)

مرتب: انوار الحق چوہدری☆

دعوت رجوع الی القرآن

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدرِ مؤسس انجمن خدام القرآن اور بانی تنظیم اسلامی کی دعوت ''رجوع الی القرآن'' کی متعدد جہتیں (facets) ہیں۔ عوام کے لئے ڈاکٹر صاحب کے دروسِ قرآن اور خطباتِ جمعہ' قرآن کالج میں نوجوان طلبہ کے لئے یونیورسٹی کورسز یعنی ایف۔ اے' بی۔ اے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم یعنی عربی گرامر' قرآن اور حدیث کی تعلیم' عمر رسیدہ اور serving احباب کے لئے عربی گرامر اور قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس' تجوید سیکھنے کے لئے سپیشل کلاسز۔

تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل۔ دورۂ ترجمۂ قرآن

۱۹۸۴ء سے ہر سال ماہِ رمضان میں جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں ہزاروں خواتین و حضرات مستفید ہوتے ہیں۔ قرآن اکیڈمی کے علاوہ لاہور میں دیگر بہت سے مقامات پر اور لاہور کے علاوہ سارے پاکستان میں مختلف شہروں میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ۰۳۔۲۰۰۲ء میں ماہِ رمضان میں سارے پاکستان میں تیس سے زائد مقامات پر دورۂ ترجمۂ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔

اس کے علاوہ محترم ڈاکٹر صاحب کے لاکھوں کی تعداد میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹس

☆ ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

تمام دنیا میں پھیل چکے ہیں جن کے ذریعہ سے قرآن مجید کی تعلیمات کو نوعِ انسانی کے لئے عام کیا گیا ہے۔

شعبہ خط و کتابت کورسز

ان سب کے علاوہ ایسے طلبہ و طالبات' خواتین و حضرات کے لئے' جو ملک سے یا لاہور سے باہر ہیں یا جن کے لئے کسی وجہ سے قرآن کالج رقرآن اکیڈمی لاہور میں حاضری ممکن نہیں' خط و کتابت کورسز ترتیب دیئے گئے ہیں' تاکہ سب گھر بیٹھے بٹھائے سہولت کے ساتھ اپنے فارغ وقت میں عربی گرامر اور قرآن کی تعلیم حاصل کر سکیں اور درج ذیل کورسز سے استفادہ کر سکیں:

i) قرآنِ حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس
ii) ابتدائی عربی گرامر (حصہ اوّل) کورس
iii) ابتدائی عربی گرامر (حصہ دوم) کورس
iv) ابتدائی عربی گرامر (حصہ سوم) کورس
v) ترجمۂ قرآن کریم کورس

پہلے کورس کا آغاز جنوری ۱۹۸۸ء میں کیا گیا۔ اس کورس کا مقصد خواتین و حضرات اور طلبہ و طالبات کو قرآن حکیم کے مربوط مطالعے کے ذریعے دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور سے متعارف کرانا ہے۔ بفضل باری تعالیٰ یہ کورس خوب زور و شور سے جاری ہے۔ اس کورس میں حصہ لینے والوں کی تعداد ۳۵۳۸ تک پہنچ چکی ہے۔ بیرونِ ملک اس کورس کا اجراء سعودی عرب میں جدہ' مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' ریاض' دہران اور الواسیع میں ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ابوظہبی' دبئی' شارجہ' راس الخیمہ' انگلینڈ' فرانس' کینیڈا اور امریکہ میں بھی اس کورس کا اجراء ہو چکا ہے۔

ان کورسز کو متعارف کرانے کے لئے اقدام

۲۰۰۳-۲۰۰۲ء کے دوران ان دونوں کورسز کو بڑے پیمانہ پر متعارف کرانے

کے لئے مندرجہ ذیل اقدام کئے گئے ہیں:

۱) انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے اپنے ماہانہ جرائد ''حکمت قرآن'' اور ''میثاق'' میں وقفہ وقفہ سے ان کورسز کے اشتہارات شائع کرائے گئے۔

۲) ان کورسز کو پبلک میں متعارف کرانے کے لئے روزنامہ ''جنگ'' میں سال میں دو دفعہ اشتہارات دیئے گئے۔

۳) ماہنامہ ''کوثر'' میں بھی ان کورسز کے بارے میں اشتہارات شائع کرائے گئے۔

۴) ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز نے اپنے احباب اور ہم خیال دوستوں کو ان کورسز سے متعارف کرانے کے لئے ذاتی خطوط بھی تحریر کئے۔

۵) لاہور کی بڑی بڑی لائبریریوں کے انچارج حضرات کو ان کورسز کے بارے میں خطوط لکھے گئے۔ ان سے استدعا کی گئی کہ ان کورسز کے اشتہارات اپنی لائبریریوں کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کریں۔ انہیں اشتہارات' کورسز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارمز بھی بھجوائے گئے۔

۶) ماڈل ٹاؤن کی مسجدوں میں ماہِ رمضان میں شعبہ خط و کتابت کورسز کے اشتہارات نوٹس بورڈوں پر آویزاں کئے گئے تاکہ پبلک اور طلبہ ان کورسز سے متعارف ہو کر مستفید ہو سکیں۔

۷) ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں بعد نمازِ عصر معتکفین حضرات کو ایک لیکچر کے ذریعہ ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز نے شعبہ کے کورسز کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ کورسز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارم بھی تقسیم کئے گئے۔

۸) ماہِ رمضان میں جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں کورسز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارمز رکھے گئے تاکہ نمازی حضرات ان کا مطالعہ کر کے ان سے مستفید ہو سکیں۔

۹) ۳۰ مئی ۲۰۰۳ء کو قرآن اکیڈمی میں ناظم شعبہ نے ایک سالہ کورس کے طلبہ اور طالبات کو شعبہ خط و کتابت کورسز کے بارے میں ایک لیکچر دیا اور معلومات بہم پہنچائیں۔ پراسپکٹس اور داخلہ فارمز بھی تقسیم کئے گئے۔

۱۰) قرآن کالج میں ۸ جون ۲۰۰۳ء کو تیس روزہ دینی معلومات تربیتی کورس کے طلبہ کو ایک لیکچر کے ذریعہ شعبہ کے کورسز سے متعارف کرایا گیا۔ پراسپکٹس اور داخلہ فارمز بھی تقسیم کئے گئے۔

۱۱) پنجاب یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات، ہاسٹلز اور جامع مسجد میں نوٹس بورڈوں پر شعبہ خط وکتابت کورسز کے اشتہارات طلبہ وطالبات کی اطلاع کے لئے چسپاں کئے گئے۔

موازنہ

		جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء	جولائی ۲۰۰۲ء تا جون ۲۰۰۳ء
۱)	قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی کورس:		
	ا) دورانِ سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۶۷	۶۷
	ب) دورانِ سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۱۴	۱۲
۲)	عربی گرامر کورس (حصہ اول):		
	ا) دورانِ سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۱۲۱	۱۲۸
	ب) دورانِ سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۳۲	۱۷
۳)	عربی گرامر کورس (حصہ دوم):		
	ا) دورانِ سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۲۰	۱۹
	ب) دورانِ سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۱۷	۱۲
۴)	عربی گرامر کورس (حصہ سوم):		
	ا) دورانِ سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۱۶	۰۸
	ب) دورانِ سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۰۷	۰۶
۵)	ترجمۂ قرآن کریم کورس:		
	ا) دورانِ سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۱۵۳	۱۵۰
	ب) دورانِ سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۲۱	۱۸

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : منشور قرآن (انڈکس مضامین قرآن کریم)

مؤلف : عبدالحکیم ملک

ضخامت:1312 صفحات ..... ہدیہ:-/450 روپے

ناشر: اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن' 9۔رحیم آباد' پنجند روڈ' مظفرگڑھ

ملنے کے پتے: ☆فیروز سنز' لاہور۔ ☆مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار' لاہور۔

☆ادارہ اسلامیات' انارکلی' لاہور۔ ☆منشورات' منصورہ' لاہور۔

قرآن مجید نوع انسانی کی ہدایت کا منشور ہے۔اسے سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے۔چنانچہ اس کی تفہیم کے لئے بے شمار کتب لکھی گئی ہیں۔ ہر کسی نے کوشش کی ہے کہ وہ مؤثر ترین انداز میں قرآنی تعلیمات پیش کرے۔منشور قرآن بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

منشورِ قرآن ایک عجیب وغریب کتاب ہے۔اس میں قرآن مجید میں بیان شدہ مضامین کا انڈکس دیا گیا ہے۔فہرست میں مطلوبہ مضمون دیکھ کر اُس کے متعلقہ صفحات دیکھیں تو وہاں اس مضمون کے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات یکجا ملیں گی۔اس طرح یہ کتاب قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے سہولت فراہم کرتی ہے۔

اس کتاب میں قرآن مجید میں بیان کردہ مضامین کا اشاریہ اردو' عربی اور انگریزی تین زبانوں میں دیا گیا ہے۔ ہر صفحہ تین کالموں پر مشتمل ہے۔درمیان والے کالم میں متعلقہ مضمون کی آیات مع حوالہ درج کی گئی ہیں' جبکہ دائیں طرف والے کالم میں ان آیات کا اردو ترجمہ مع حوالہ اور بائیں کالم میں انگریزی ترجمہ مع حوالہ لکھا گیا ہے۔

منشور قرآن بہت محنت اور کاوش کے ساتھ تیار کی گئی ہے' جسے وقت کے علماء نے بہت پسند کیا ہے اور مفید قرار دیا ہے۔منشور قرآن تعلیم وتحقیق سے وابستہ اساتذہ کے علاوہ ماہرین

قانون' جدید تعلیم یافتہ طبقہ' کاروباری و ملازمت پیشہ افراد' اربابِ اختیار' سکول و کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اور مساجد میں خطبہ دینے والے حضرات کے لئے یکساں مفید ہے۔ اس کے مؤلف مبارک باد اور تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے سالہا سال کی محنت کے نتیجہ میں اتنی وقیع' مفید اور قابل قدر کتاب مرتب کی' حالانکہ انہیں اُن دنوں کمپیوٹر کی سہولت بھی میسر نہ تھی۔

اس کتاب کی شایانِ شان پذیرائی ہوئی۔ وقت کے علماء اور دانش وروں نے اسے قرآن فہمی کے لئے انتہائی مفید قرار دیا اور اس کی تعریف و تحسین کی۔ اس کتاب کی اشاعت میں سعی و جہد خود بڑا کارِ ثواب ہے۔ ہر اچھی لائبریری میں اس کتاب کا پایا جانا ضروری ہے۔

کتاب خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ مضبوط جلد میں محفوظ ہے۔ یوں حسن باطنی کے ساتھ ساتھ جمالِ ظاہری سے بھی آراستہ ہے۔ تاہم کہیں کہیں کمپوزنگ کی اغلاط پائی جاتی ہیں۔

(۲)

نام کتاب : فلسفہ سیرت خاتم الانبیاء

مصنف : سید تصدق بخاری

ضخامت: 640 صفحات ..... قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ نعمانیہ' اردو بازار' گوجرانوالہ

رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر اَن گنت کتابیں لکھی جا چکی ہیں' مگر ہر مصنف کا اپنا مخصوص اندازِ بیان اور خاص زاویہ نگاہ ہے۔ سید تصدق بخاری تحقیقی ذہن کے مالک ہیں اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں' لہٰذا ان کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں سیرتِ پاک کے مختلف واقعات کی حکمت اور توجیہہ بیان کی ہے اور اس کے لئے بڑی محنت اور کاوش سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ فلسفہ تو نام ہی ''کیوں'' اور ''کیسے'' کا ہے۔ چنانچہ مصنف نے آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف واقعات کو فلسفیانہ انداز سے دیکھتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ مثلاً آپؐ کی پیدائش کے موقع پر کسریٰ نوشیرواں کے شاہی محل کے چودہ کنگرے زلزلے سے گر گئے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ولادت باسعادت کے بعد اب فارس کے چودہ بادشاہوں کے بتدریج قتل کے بعد سلطنت کسریٰ غارت ہو جائے گی اور اس کی ساری شان و شوکت زمین بوس ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یکے

بعد دیگرے چودہ بادشاہ قتل ہوئے۔ آپؐ کی تاریخ پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ۹ ربیع الاوّل کو صحیح کہا ہے اور پھر نو کے ہندسے کا امتیاز باقی ہندسوں پر ثابت کیا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے اسمائے گرامی ''محمدؐ'' اور ''احمد'' کے معانی اور مطالب کی ندرت بیان کرتے ہوئے اسم احمد کو نماز کے ارکان کا مظہر بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''ا'' کی شکل قیام کی سی ہے ''ح'' کی شکل رکوع کی سی ہے ''م'' سجدے کی حالت کو ظاہر کر رہی ہے جبکہ ''د'' کی شکل نماز میں قعدے کی طرح ہے۔

آپ ﷺ کے والدین اور رضاعی ماں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جس مولودِ مسعود کو باپ کے خون سے عبودیتِ الٰہی اور ماں کے بطن اطہر و اطیب سے امن عامہ و خاصہ اور رضاعی والدہ کے دودھ سے حلم و بردباری اور سعادت کی گھٹی اور غذا ملی ہو وہ بھلا خصائل حمیدہ اور صفاتِ محمودہ سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ساری دنیا کی زبان سے محمد و احمد کیوں نہ کہلائے!''

کتاب تحقیق و جستجو، محنت اور کوشش کا مظہر ہے۔ تحقیقی ذہن رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مزید راہیں وا کرے گا۔ سیرت مطہرہ کے متعلق بہت سی باتیں جو کئی دوسری کتابوں میں موجود ہیں، وہ مصنف نے اس کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ چونکہ سیرت نویسی میں مصنف کا انداز معمول سے مختلف ہے اس لئے اس کتاب کا مطالعہ قاری کے لئے دلچسپی کا باعث بھی ہے۔

کتاب مضبوط جلد میں محفوظ ہے۔ کتابت کی غلطیاں جابجا موجود ہیں۔ اگر کمپوزنگ کمپیوٹر پر ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

(۳)

نام کتاب : آثارِ صالحہ

مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت: 242 صفحات ..... قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور

مولانا عبدالقیوم حقانی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آثار صالحہ ان کی تازہ تصنیف ہے۔ یہ ایک پارسا عورت کی داستانِ زندگی کا مرقع ہے۔

صالحہ خاتون بنت ظہیر الدین ڈاکٹر عرفان الکریم الانصاری کی رفیقۂ حیات تھیں۔

قانون' جدید تعلیم یافتہ طبقہ' کاروباری و ملازمت پیشہ افراد' اربابِ اختیار' سکول و کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اور مساجد میں خطبہ دینے والے حضرات کے لئے یکساں مفید ہے۔ اس کے مؤلف مبارک باد اور تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے سالہا سال کی محنت کے نتیجہ میں اتنی وقیع' مفید اور قابل قدر کتاب مرتب کی' حالانکہ انہیں اُن دنوں کمپیوٹر کی سہولت بھی میسر نہ تھی۔

اس کتاب کی شایانِ شان پذیرائی ہوئی۔ وقت کے علماء اور دانش وروں نے اسے قرآن فہمی کے لئے انتہائی مفید قرار دیا اور اس کی تعریف و تحسین کی۔ اس کتاب کی اشاعت میں سعی و جہد خود بڑا کارِ ثواب ہے۔ ہر اچھی لائبریری میں اس کتاب کا پایا جانا ضروری ہے۔

کتاب خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ مضبوط جلد میں محفوظ ہے۔ یوں حسن باطنی کے ساتھ ساتھ جمالِ ظاہری سے بھی آراستہ ہے۔ تاہم کہیں کہیں کمپوزنگ کی اغلاط پائی جاتی ہیں۔

(۲)

نام کتاب : فلسفہ سیرت خاتم الانبیاء

مصنف : سید تصدق بخاری

ضخامت: 640 صفحات ..... قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ نعمانیہ' اردو بازار' گوجرانوالہ

رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر اَن گنت کتابیں لکھی جا چکی ہیں' مگر ہر مصنف کا اپنا مخصوص اندازِ بیان اور خاص زاویہ نگاہ ہے۔ سید تصدق بخاری تحقیقی ذہن کے مالک ہیں اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں' لہٰذا ان کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں سیرتِ پاک کے مختلف واقعات کی حکمت اور توجیہہ بیان کی ہے اور اس کے لئے بڑی محنت اور کاوش سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ فلسفہ تو نام ہی ''کیوں'' اور ''کیسے'' کا ہے۔ چنانچہ مصنف نے آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف واقعات کو فلسفیانہ انداز سے دیکھتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ مثلاً آپؐ کی پیدائش کے موقع پر کسریٰ نوشیرواں کے شاہی محل کے چودہ کنگرے زلزلے سے گر گئے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ولادت باسعادت کے بعد اب فارس کے چودہ بادشاہوں کے بتدریج قتل کے بعد سلطنت کسریٰ غارت ہو جائے گی اور اس کی ساری شان و شوکت زمین بوس ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یکے

بعد دیگرے چودہ بادشاہ قتل ہوئے۔ آپؐ کی تاریخ پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ۹ ربیع الاوّل کو صحیح کہا ہے اور پھر نو کے ہندسے کا امتیاز باقی ہندسوں پر ثابت کیا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے اسمائے گرامی ''محمد'' اور ''احمد'' کے معانی اور مطالب کی ندرت بیان کرتے ہوئے اسم احمد کو نماز کے ارکان کا مظہر بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''ا'' کی شکل قیام کی سی ہے ''ح'' کی شکل رکوع کی سی ہے ''م'' سجدے کی حالت کو ظاہر کر رہی ہے جبکہ ''د'' کی شکل نماز میں قعدے کی طرح ہے۔

آپ ﷺ کے والدین اور رضاعی ماں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جس مولودِ مسعود کو باپ کے خون سے عبودیتِ الٰہی اور ماں کے بطن اطہر و اطیب سے امن عامہ و خاصہ اور رضاعی والدہ کے دودھ سے حلم و بردباری اور سعادت کی گھٹی اور غذا ملی ہو وہ بھلا خصائل حمیدہ اور صفاتِ محمودہ سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ساری دنیا کی زبان سے محمد و احمد کیوں نہ کہلائے!''

کتاب تحقیق و جستجو، محنت اور کوشش کا مظہر ہے۔ تحقیقی ذہن رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مزید راہیں وا کرے گا۔ سیرت مطہرہ کے متعلق بہت سی باتیں جو کئی دوسری کتابوں میں موجود ہیں، وہ مصنف نے اس کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ چونکہ سیرت نویسی میں مصنف کا انداز معمول سے مختلف ہے اس لئے اس کتاب کا مطالعہ قاری کے لئے دلچسپی کا باعث بھی ہے۔

کتاب مضبوط جلد میں محفوظ ہے۔ کتابت کی غلطیاں جا بجا موجود ہیں۔ اگر کمپوزنگ کمپیوٹر پر ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

(۳)

نام کتاب : آثارِ صالحہ

مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت: 242 صفحات ..... قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور

مولانا عبدالقیوم حقانی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آثار صالحہ ان کی تازہ تصنیف ہے۔ یہ ایک پارسا عورت کی داستانِ زندگی کا مرقع ہے۔

صالحہ خاتون بنت ظہیر الدین ڈاکٹر عرفان الکریم الانصاری کی رفیقۂ حیات تھیں۔

معروف معنوں میں وہ کوئی عالمہ فاضلہ نہ تھیں' مگر انہیں صحیح اسلامی زندگی گزارنے کی خواہش تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے وقت کے بڑے بڑے علمائے کرام سے بذریعہ خط و کتابت راہنمائی حاصل کی اور اپنی زندگی کو صحیح اسلامی اصولوں پر استوار کیا۔

اس کتاب میں صالحہ خاتون کے ان استفسارات کو مع جوابات جمع کر دیا گیا ہے جو انہوں نے حضرت مولانا خیر محمد جالندھری' حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی' حضرت مولانا علامہ غلام محمد اور حضرت مولانا حکیم محمد اختر سے کئے۔ یہ چاروں حضرات اپنے وقت کے صلحاء اور اتقیاء میں شمار ہوتے ہیں اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سلسلۂ رشد و ہدایت سے وابستہ ہیں۔

سوالات زندگی میں پیش آنے والی ہر صورتِ حال کے متعلق ہیں جن کے جوابات صحیح اسلامی زندگی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ مولانا عبدالقیوم حقانی نے مرحومہ کی اس خط و کتابت کو شایانِ شان انداز میں مرتب کر دیا ہے۔ یہ انتہائی مختصر مگر جامع خطوط روحانی بیماریوں کے لئے اکسیر نسخے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایک عام عورت خدا رسیدگی کے معزز مقام تک رسائی کی پوری داستانِ معرفت سے آگاہ ہو سکتی ہے اور اُس میں خدا کا خوف' شوہر کی خدمت کا جذبہ' اللہ کے ذکر کا شوق' نیک اور پارسا اہل علم کے ساتھ وابستگی اور صحیح اسلامی زندگی گزارنے کی چاہت پیدا ہو سکتی ہے۔

۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو اِس پاک باز خاتون کا انتقال عین اس وقت ہوا جب وہ فجر کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اس طرح مرحومہ اپنی خواہش کے مطابق اللہ کا ذکر کرتے کرتے بارگاہِ خداوندی میں پہنچ گئیں۔

کتاب کے اخیر میں مرحومہ کا وصیت نامہ خاص پڑھنے کی چیز ہے کہ اس نے اپنے وارثوں کو کس طرح صحیح اسلامی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی اور دنیا کی بے ثباتی واضح کرتے ہوئے آخرت کے لئے زادِ راہ اکٹھا کرنے کی ضرورت واضح کی۔

اس کتاب کا مطالعہ فکر و عمل کی صحت کا جذبہ پیدا کرے گا۔ اس دَور کی عورتوں کے لئے صالحہ خاتون کا مثالی کردار راہ نما مینار ثابت ہوگا' کیونکہ اس نے آج کے ماحول میں پاکیزہ زندگی گزار کر دکھائی ہے۔ کتاب خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ مضبوط جلد میں محفوظ ہے۔ کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیاں موجود ہیں۔ oo

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

❁ حیات و سیرتِ اقبال ❁ فلسفہ اقبال
❁ ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

(از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆☆☆

❁ اقبال اور قرآن ' از قلم: سید نذیر نیازی

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) 72 روپے
اشاعت عام: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000